باغ و بہار: خطّی نسخۂ جے پور تدوینِ متن کی ایک ناقص مثال

ٹی آر رینا

کسی خطّی یا مطبوعہ نسخے کی تدوین سے قبل ایک خاکہ تیار کیا جاتا ہے، پھر دھیرے دھیرے تدوینی اُصولوں کے مطابق اس کی حدود میں رہ کر عمل کیا جاتا ہے۔ اس بات کا خاص طور سے دھیان رکھا جاتا ہے کہ مدوِن جو چیز بھی پیش کرے، دستاویزی شواہد کے ساتھ ہوں، تاکہ مطالعے کے دوران قاری کو کسی قسم کی اُلجھن محسوس نہ ہو اور نسخے کی صحیح تصویر اُس کے سامنے آجائے۔

اگر مرتّب خطّی نسخے پر کام کر رہا ہے تو اُسے چند بنیادی باتوں پر توجہ مرکوز کرنی پڑے گی۔ مثلاً: اوّل یہ خطّی نسخہ کس نے قلم بند کیا؟ دوم یہ کہاں قلم بند ہوا؟ سوم اس کا دن، ماہ و سال کیا ہے؟ چہارم، اوّل یہ کس کی ملکیت رہا، کہاں کہاں سے ہوتا ہوا آخر یہ کس شخصیت یا کتب خانے تک پہنچا؟ مدوِن تک کیا یہ اصلی یا عکسی صورت میں پہنچا؟ کاتب اور مدون کے درمیان زمانی فاصلہ کتنا ہے؟ اس کا کاغذ کیسا ہے، روشنائی کیسی ہے، قلم ایک ہی استعمال ہوا ہے یا مختلف؟ اس کی املائی صورت کیا ہے، حرکات و علامات کا کس حد تک استعمال ہوا ہے، رموز و اوقاف کی پابندی کی گئی ہے یا نہیں؟

اس کی نقلیں کن کن کتب خانوں میں ہیں یا یہ واحد نسخہ ہے جو مدون تک پہنچا۔ اس نسخے کا مسطر کتنی سطری ہے، کیا اِس کے متن میں پیرا گراف کا التزام رکھا گیا یا نہیں؟ مصنف یا کاتب نے اس میں عنوانات قائم کیے ہیں یا نہیں؟ کیا مدون اس نسخے کو رائج الوقت املا کے مطابق مرتب کرنا چاہتا ہے یا کہ جس صورت میں مصنف یا کاتب نے اسے قلم بند کیا ہے؟ ان دونوں میں سے ایک طریقہ کار پر عمل کرنا ہوگا اور اختلافِ نسخ یا ضمیمۂ تشریحات میں اپنے موقف کی وضاحت کرنا ہوگی۔

متن سے قبل مقدمے میں مصنف یا کاتب کے حالاتِ زندگی تفصیلاً درج کرنے ہوں گے۔ مصنف یا کاتب کا متن کتنے صفحات پر اور آپ کا مطبوعہ نسخہ کتنے صفحات کو محیط ہے؟ خطّی نسخے کا سرورق، بیچ کے چند صفحات کے علاوہ اس کے آخری صفحے کا عکس مطبوعہ نسخے میں ضرور شامل ہونا چاہیے۔ آپ نے مطبوعہ نسخہ تیار کرتے وقت کتنے مطبوعہ و غیر مطبوعہ نسخوں سے استفادہ کیا ہے کی تفصیل بتانا بھی لازم ہے۔

* ریسرچ اسکالر، مقیم: جموں کشمیر، وٹس ایپ: +91 9419828542

مطبوعہ نسخے کو جب مرتب کیا جاتا ہے تو اس کے خطّی نسخے کے اصولوں میں تھوڑا سا فرق ہوتا ہے۔ سب سے پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ یہ نسخہ کس نسخے کو بنیاد بنا کر مرتب کیا گیا۔ کیا یہ روایتِ اوّل یعنی مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے یا نقل در نقل ہے؟ مطبوعہ و روایتِ اوّل میں زمانی فاصلہ کتنا ہے۔ جس نسخے کو بنیاد بنایا گیا اُس کا کاتب کون ہے؟ یہ کب، کس مقام، کس پریس اور کس کے اہتمام سے طبع ہوا؟ اِس کی قیمت، صفحات کی تعداد، مسطر اور ایڈیشن کا ذکر کرنا بھی لازم ہے۔ املائی صورت، حرکات و علامات اور رموز واو قاف خطّی نسخے کی طرح ہی نظر میں رہنی چاہییں۔

اس مطبوعہ نسخے کے ایڈیشن کن کن کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ کیا آپ نے ان باقی ایڈیشنوں کے عکس حاصل کیے یا سیدھے ہی بغیر تقابل کے مطبوعہ نسخے کو بنیاد بنا لیا؟ مصنف کے حالاتِ زندگی مقدمے میں درج کرنے ہوں گے۔ اختلافِ نسخ، ضمیمہ تشریحات فرہنگ آخر میں شامل ہونے چاہییں۔ مطبوعہ نسخے کے سرورق، درمیانی صفحات اور آخری صفحے کا عکس بھی شاملِ کتاب کیا جائے تاکہ مطبوعہ نسخے سے متعلق معلومات میں اضافہ ہو۔ کیا آپ کے مرتب کردہ نسخے اور بنیادی مطبوعہ نسخے میں پیراگراف کا التزام رکھا گیا ہے؟ کیا روایتِ اول اور مطبوعہ نسخے میں عنوانات کی صورت میں یکسانیت پائی جاتی ہے یا نہیں؟ مجموعہ کلام ہو تو اس میں الحاقی کلام کی نشان دہی کی جائے (جو نہایت ہی مشکل کام ہے) اگر نثری نسخہ ہے تو اِس بات کو نظر میں رکھا جائے کہ کہیں تحریف یا حذف و اضافہ تو نہیں ہوا۔

مذکورہ بالا تدوینی اصولوں کی روشنی میں اب ہم نسخۂ جے پور سے متعلق گفتگو کریں گے۔

خطّی نسخۂ جے پور کے مرتب ڈاکٹر فیروز احمد نے اپنے مطبوعہ نسخے کے صفحہ ۷، ۱۵ اور ۱۶ کے آخر میں قیاساً یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ''میر امن اپنے اصلی نام امام علی اسدی کے ساتھ ۱۸۳۲ء تک زندہ رہے اور نسخۂ جے پور کا کاتب کوئی اور نہیں بل کہ خود میر امن ہیں''۔

خطّی نسخۂ جے پور کے آخر میں جو ترقیمہ مرتب نے شامل کیا ہے وہ یوں درج ہے:

''تمت الکتاب بعنوان الملک الوہاب بتاریخ دہم شہر شوال ۱۲۴۷ھ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم در چھاؤنی ہانسی وقت ملازمی کمپنی بہادر وقت شب بپاسِ خاطر قرۃ العین احسان علی طالعمرہ و زاد علمہ، سُمتِ اتمام و صورتِ اختتام یافت۔ کاتب عاصی پُر معاصی خاکسار امام علی اسلامی غفر اللہ لہ ولوالدیہ واحسن الیہما والہ

ایں نوشتم بر کتابِ دلفروز
مالکش اللہ تحویلم دوروز''

اگر یہ نسخہ ہانسی (موجودہ ہریانہ ریاست) میں تیار ہوا تو اسے نسخۂ جے پور کا نام کیوں دیا گیا؟ ہانسی میں یہ نسخہ کس کی ملکیت تھا اور کس کس مقام سے ہوتا ہوا جے پور پہنچا؟ جے پور میں یہ کس نجی یا سرکاری کتب خانے میں محفوظ تھا؟

اگر یہ کسی ادارے کی ملکیت تھا تو اِس پر اُس ادارے کی مہر اور رجسٹریشن نمبر ضرور درج ہونا چاہیے تھا۔ اگر یہ کسی ایک شخص کی ملک رہا ہو تو بھی اِس کے سرورق یا اندر کے صفحے پر اُس کے دستخط ہونے چاہییں۔ اگر یہ راجستھان یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو کے کتب خانے میں تھا تو بھی اس پہ شعبے کی مہر اور جسٹریشن نمبر ہونا چاہیے تھا۔

مرتب تک یہ نسخہ کیسے پہنچا اِس کی کوئی تفصیل اِن کے مطبوعہ نسخے کے مقدمے میں کہیں درج نہیں۔ یہ بات بھی درج نہیں کہ جس نسخے کو بنیاد بنایا گیا وہ اصل نسخہ ہے یا اس کا عکس۔ مرتب نے یہ لکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ اس نسخے کی اور نقلیں کس کس کتب خانے میں ہیں یا یہ واحد نسخہ ہے جو سیدھا اُن تک پہنچا۔

مرتب کا اِس خطّی نسخے سے متعلق جو تعارفی مضمون بہ عنوان باغ و بہار کا ایک قدیم مخطوطہ ماہ نامہ کتاب نما نئی دہلی کے شمارہ نمبر ۱۰، جلد نمبر ۳۶، ص ۹ تا ۲۱، بابت اکتوبر ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا، اُس میں بھی اس قسم کا کوئی ذکر نہیں۔ (اس کا عکس میرے سامنے ہے)۔ مرتب نے اپنے مطبوعہ نسخے کے ص ۷ پر صرف اتنا اشارہ دیا ہے۔ ''باغ و بہار کے اس نسخۂ جے پور سے متعلق راقم الحروف کا ایک تفصیلی مضمون ماہ نامہ کتاب نما (دہلی) کے اکتوبر ۱۹۹۶ء کے شمارے میں شائع ہو چکا ہے''۔

کیا یہ تحقیقی و تدوینی اصولوں کی خلاف ورزی نہیں ہے؟ قاری اس مضمون کی تفصیل کہاں تلاش کرتا پھرے گا۔ اُسے کیا معلوم کہ ماہ نامے میں جو مضمون شائع ہوا ہے اُس میں کیا کیا درج ہے؟

تعارفی مضمون کے شائع ہونے اور خطّی نسخے کے درمیان ایک سو ساڑھے چونسٹھ برس کا زمانی فاصلہ ہے۔ جب یہ نسخہ مطبوعہ صورت میں منظر عام پر آیا تو یہ زمانی فاصلہ ۱۸۰ برس سے تجاوز کر گیا۔

مرتب کے مطابق نسخۂ جے پور کا متن مکمل، خط نستعلیق صاف اور واضح ہے پڑھنے میں کسی قسم کی دشواری نہیں۔ کاغذ باریک ہونے کی وجہ سے کمزور ہو چلا ہے۔ متن سیاہ روشنائی سے لکھا گیا ہے، لیکن عنوانات اور کبت سرخ روشنائی سے درج کیے گئے ہیں۔ جہاں کہیں اردو اور فارسی کی کوئی کہاوت یا محاورے کا استعمال ہوا ہے ان پر سرخ روشنائی سے خط کشید کیا گیا ہے۔ مسطر ۱۷ سطری ہے اور اوراق کی تعداد ایک سو تیس یعنی ''دو سو ساٹھ صفحے ہیں'' (ص ۲۹، سطر ۴) یہ 'دو سو ساٹھ صفحے' ہونے چاہیے تھے۔ (تعارفی مضمون کے ص ۱۱ کی سطر ۱۵ میں دو سو ساٹھ صفحے درج ہے)

اسے ہم کاتب کی غلطی قرار دینے کے بجائے پروف ریڈر کی غلطی مانتے ہیں۔ مطبوعہ نسخے کے متن میں ایسی بہت سی لغزشیں ہوئی ہیں جن کا ذکر مناسب مقامات پر آئے گا۔

نسخۂ جے پور کے مرتب کا یہ کہنا کہ ہند و پاک میں باغ و بہار کے جتنے نسخے شائع ہوئے وہ زیادہ تر فورٹ ولیم کالج کے مطبوعہ نسخے (۱۸۰۴ء) اور ڈنکن فاربس کے مطبوعہ نسخوں پر مبنی ہیں کسی حد تک درست بات ہے۔ اپنی بات کو وہ اس طرح آگے بڑھاتے ہیں:

> مولوی عبدالحق نے جو متن مرتب کیا، اس کی بنیاد انھوں نے ڈنکن فاربس کے مرتبہ چوتھے ایڈیشن پر رکھی۔ پاکستان سے ابوالخیر کشفی اور سلیم اختر نے باغ و بہار کا جو متن مرتب کیا، اس کی بنیاد بالترتیب ''ممتاز مولویوں'' کی نگرانی میں شائع کیے گئے ۱۸۳۹ء اور ڈنکن فاربس کے ۱۸۷۳ء والے متن پر ہے۔ ۱۹۹۲ء میں شائع شدہ باغ و بہار کا متن مرتبہ رشید حسن خاں باغ و بہار کی طباعتِ اوّل کا ترجمان ہے اور اسی طرح ۲۰۰۴ء میں مرزا حامد بیگ کے مرتبہ متن کی بنیاد اُس نسخے پر ہے جسے ۱۸۴۳ء میں فیض اللہ نے شائع کیا تھا۔[1]

اِس اقتباس میں درج اِن باتوں پر ذرا غور کیجیے، مثلاً: مولوی عبدالحق نے اپنے ''متن کی بنیاد ڈنکن فاربس کے مرتبہ چوتھے ایڈیشن پر رکھی''۔ اس مطبوعہ نسخے کا سال اشاعت درج نہیں کیا۔ دوسری بات ''ممتاز مولویوں'' سے مرتب کی کیا مراد ہے؟ ان کے نام درج ہونے چاہیے تھے۔ تیسری بات: ''ڈنکن فاربس کے ۱۸۷۳ء والے متن پر ہے''۔

رشید حسن خاں صاحب کا مطبوعہ نسخہ ۱۹۹۲ء مرتب کے پاس موجود تھا۔ اس کا انھوں نے بہ غور مطالعہ بھی کیا تھا۔ میرے سامنے خاں صاحب کی اشاعت سوم ۲۰۰۹ء موجود ہے۔ اس کے صفحہ ۹۰ پر ڈنکن فاربس کے حوالے سے انھوں نے باغ و بہار کی پانچ اشاعتوں کا ذکر کیا ہے۔ پہلی ۱۸۴۶ء، دوسری ۱۸۴۹ء، تیسری ۱۸۵۱ء، چوتھی ۱۸۶۰ء اور پانچویں ۱۸۶۲ء (انگریزی ترجمہ)۔ یہ سبھی اشاعتیں لندن سے شائع ہوئیں۔ یہ نسخے انڈیا آفس لندن کے علاوہ بمبئی یونی ورسٹی لائبریری اور ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں موجود ہیں۔

ڈاکٹر فیروز احمد نے ڈنکن فاربس کے ۱۸۷۳ء والے نسخے کو چوتھا ایڈیشن قرار دیا ہے اور اس کے لیے اپنے مطبوعہ نسخے کے صفحہ ۲۲ کے حواشی میں جو عبارت درج کی ہے آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

> یہ ایڈیشن چھپا تو ۱۸۷۳ء میں، لیکن فاربس اسے اپنی موت (۱۸۶۸ء) سے قبل مرتب کر چکا تھا، لیکن بعض قانونی وجوہ سے اس کی اشاعت میں تاخیر ہوئی۔[2]

اگر ڈاکٹر فیروز احمد کو مرزا حامد بیگ کے حوالے پر یقین تھا تو انھیں یہ لکھنا چاہیے تھا کہ ڈنکن فاربس کی باغ و بہار کی پانچ نہیں چھے اشاعتیں ہیں اور ۱۸۷۳ والا نسخہ فلاں کتب خانے میں محفوظ ہے۔ مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ وہ اپنے مطبوعہ نسخے کے صفحہ ۷ کے تیسرے اقتباس میں پہلے ہی یہ درج کر چکے ہیں کہ ''فرہنگ اور حواشی کی ضرورت

یوں محسوس نہیں ہوئی کہ اول تو یہ ہمارے مقصد میں شامل نہیں اور دوم یہ کہ باغ و بہار کے مختلف ایڈیشن میں انھیں دیکھا جا سکتا ہے''۔

ڈاکٹر فیروز احمد کے تحقیقی وتدوینی اصولوں کی داد دیجیے جو انھوں نے نسخۂ جے پور مطبوعہ ایڈیشن کے لیے وضع کیے ہیں۔ انھوں نے ہند و پاک میں آج تک باغ و بہار کے جتنے بھی نسخے شائع ہوئے ہیں انھیں رد کرتے ہوئے یہ لکھا ہے ''کہ اس کی اشاعت کا سب سے بڑا جواز یہ ہے کہ آج تک باغ و بہار کا کوئی ایسا متن منظر عام پر نہیں آسکا جو کسی خطّی نسخے پر مبنی ہو اور جس میں کتابت کی درستگی کا غیر معمولی اہتمام بھی موجود ہو۔ چناں چہ ہمارے نزدیک اس کی حیثیت ایسے بنیادی متن کی ہے جو منشائے مصنف کا ترجمان ہے اور اگر امام علی اسدی کو میر امّن تسلیم کر لیا جائے تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ نسخۂ جے پور اصلاً خود میر امّن کا تحریر کردہ ہے''۔[۳]

مرتب نے باقی نسخوں کو رد کرتے ہوئے اسے معتبر سمجھ کر شائع کیا ہے تو پھر حواشی کے لیے رد شدہ نسخوں سے رجوع کرنے کی صلاح کیوں دیتے ہیں؟ قاری یا نئے ریسرچ اسکالر مطالعہ تو مطبوعہ نسخہ جے پور کا کریں اور حواشی کے لیے اس سے قبل کے شائع شدہ نسخوں کو جمع کرتے پھریں۔

کیا امام علی اسدی ہی اصل میں میر امن ہے اور نسخۂ جے پور میر امّن کے ہاتھ کا نقل کردہ ہے؟ اس کا ذکر مناسب وقت پر آئے گا۔

مرتب نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ آج تک جتنے بھی نسخے شائع ہوئے ہیں وہ اغلاط سے پاک نہیں ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جو اغلاط نسخہ ۱۸۰۴ء کے مطبوعہ نسخے میں رہ گئیں انھیں دور نہیں کیا گیا، بل کہ نقل در نقل ہوتے ہوئے ان میں مزید اضافہ ہوتا چلا گیا۔ لیکن میر امّن نے جب ۱۸۳۲ء میں اسے نقل کیا تو یہ اغلاط سے پاک ہو گیا۔

مرتب نے بعض شائع شدہ نسخوں کے بنیادی نسخوں کا ذکر کیا ہے، مگر خود نسخۂ جے پور کے بنیادی نسخے یا نسخوں کا ذکر نہیں کیا کہ کاتب کے سامنے کون کون سے نسخے تھے جن کی مدد سے یہ نسخہ تیار کیا گیا۔

ساتھ ہی وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ''باغ و بہار کے متداولہ نسخوں میں اغلاط کی درستگی کا واحد طریقہ یہ ہے کہ خطّی نسخوں سے رجوع کیا جائے لیکن دقت یہ ہے کہ باغ و بہار کے خطی نسخے بہت کم ہیں''۔[۴]

مرتب نے نسخۂ جے پور کے علاوہ کسی ایسے خطی نسخے کا ذکر نہیں کیا جس کا تقابل انھوں نے اس نسخے سے کیا ہو۔ اسی صفحے کی اگلی سطور میں یوں لکھتے ہیں: ''جن حضرات نے قلمی نسخوں کا ذکر کیا ہے، وہ کہاں ہیں اور اُن کی کیفیت کیا ہے؟ اس کے متعلق حتمی طور پر کوئی رائے قائم کرنا مشکل ہے''۔

دوسرے قلمی نسخوں کا پتا ہی نہیں اُن سے متعلق کوئی رائے بھی قائم نہیں کی جا سکتی تو پھر نسخۂ جے پور کو انھوں نے کن بنیادوں پر معتبر مان لیا۔ یہ نسخہ ہانسی میں قلم بند ہوا تو اسے کن شواہد کی بنیاد پر نسخۂ جے پور تسلیم کر لیا گیا؟

لطف کی بات یہ ہے کہ مرتب نے روایتِ اول لندن کو بھی بہ چشم خود نہیں دیکھا ہے۔ جو باتیں دوسروں نے اپنے مطبوعہ نسخوں میں درج کیں انھی پر اکتفا کر لیا۔ حوالوں کی تصدیق کے لیے دوسروں کو انٹرنیٹ سے رجوع کرنے کا مشورہ دیتے ہیں مگر خود باغ و بہار کی روایتِ اوّل کے عکس حاصل کرنے کے لیے انٹرنیٹ کا استعمال نہیں کرتے۔

باغ و بہار اشاعتِ اوّل ۱۸۰۴ء کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں، گل کرسٹ کے مجوزہ طریقہ کار کے مطابق اکثر الفاظ پر اعراب لگائے گئے ہیں، نیز رموزِ اوقاف اور علامات کو بھی شامل عبارت رکھا گیا ہے۔ بعد کی اشاعتوں میں یہ التزام کم ہوتے گئے، یہاں تک کہ کلیتاً ختم ہو گئے۔۔۔ گل کرسٹ نے اعراب اور علامات کو فورٹ ولیم کالج کی کتابوں میں اس لیے شامل کیا تھا کہ اُس کو خوب معلوم تھا کہ ان التزامات کے بغیر اُس کے طالب علم کسی بھی متن کو صحیح طور پر نہیں پڑھ پائیں گے۔[۵]

اگر نسخۂ جے پور واقعی میر امّن کے ہاتھ سے قلم بند کیا گیا ہوتا تو اس میں ان اصولوں کا التزام ضرور ہوتا، مگر اس نسخے میں ایسا نہیں ہوا ہے۔ خطّی نسخۂ جے پور کا کاتب سیدھا لکھتا چلا گیا۔ اس کا واضح ثبوت اس نسخے کے وہ صفحات ہیں جن کا عکس مرتب نے اپنے مطبوعہ نسخے میں شامل کیا ہے۔

باغ و بہار کے علاوہ میر امّن کی دوسری کتاب گنج خوبی کا مکمل خطی نسخۂ میر امّن کے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود ہے، اس نسخے میں بھی میر امّن نے گل کرسٹ کے مقرر کردہ نظامِ املا کو ملحوظ رکھا ہے اور اکثر و بیش تر معروف و مجہول آوازوں کے لیے علامات کی پابندی بھی کی ہے، اور اس سے مصنف کا اختیار کیا ہوا طریقۂ کار ہمارے سامنے آجاتا ہے اور یوں اس طریقہ کار سے صرفِ نظر کو کسی طرح مناسب نہیں کہا جا سکتا، بل کہ اُس طریقہ کار کی پابندی کو لازم قرار دیا جائے گا"۔[۶]

فیروز احمد صاحب باغ و بہار روایت اول یا اشاعتِ اول ۱۸۰۴ء کا عکس حاصل نہیں کر سکے تو کم از کم گنج خوبی کا عکس ہی حاصل کر لیتے اور اس کے خط کا مقابلہ خطّی نسخۂ جے پور سے کر لیتے تو ان کے تمام خدشات دور ہو جاتے اور یہ آسانی سے کہہ سکتے کہ دونوں نسخوں کا کاتب ایک ہی ہے۔ ادبی دنیا اِن کی تحقیق کی داد دیتی کہ واقعی انھوں نے ایک ایسا نسخہ دریافت کیا ہے جو میر امّن کے ہاتھ کی آخری نشانی ہے۔

فورٹ ولیم کالج کا اثاثہ عرصہ ہوا دہلی منتقل ہو چکا ہے، وہاں سے مرتب آسانی سے یہ چیزیں حاصل کر سکتا تھا اور ان کی مدد سے خطّی نسخۂ جے پور کی تدوین عمل میں لائی جا سکتی تھی۔ مگر مرتب نے اصولِ تدوین کی پیروی نہیں کی بلکہ خلاف ورزی کی ہے۔

اب میر امّن کے نام و تخلص سے متعلق گفتگو کرتے ہیں:

میر امّن نے اپنی دونوں کتابوں کے دیباچوں میں اپنا نام میر امّن لکھا ہے، ہندی مینول میں بھی یہی نام ہے۔ جب کہ ڈاکٹر فیروز احمد کا یہ کہنا کہ یہ نام ڈاکٹر جان گل کرسٹ کا دیا ہوا ہے۔ ''یہ اُن کا اصلی نام نہیں ہے بل کہ عرفیت ہے''۔[۷]

مرتب ایک قدم اور آگے بڑھتے ہوئے یوں لکھتا ہے کہ ''پاکستان کے مرزا حامد بیگ نے بعض شواہد کی بنیاد پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ میر امّن کم از کم ۳۷۔۱۸۳۶ء تک زندہ رہے اور یہ کہ ان کا نام میر امّن نہیں بل کہ امان علی دہلوی تھا جو گل کرسٹ کی ایک غلطی کے سبب پہلی بار ہندی مینول (۱۸۰۲ء) میں میر امّن بنا اور پھر جب باغ و بہار کی طباعت کا سلسلہ شروع ہوا تو اس میں یہی نام لکھا گیا''۔[۸]

فیروز صاحب نے مرزا حامد بیگ کی کتاب سے ایک بھی شہادت اپنے مطبوعہ نسخے میں درج نہیں کی بلکہ اس کے لیے اسی صفحہ کے حواشی میں لکھتے ہیں آپ پہلے پاکستان سے مرزا حامد بیگ کا مطبوعہ نسخہ باغ و بہار حاصل کریں۔ اُسے سامنے رکھ کر ان کے مطبوعہ نسخۂ جے پور کا مطالعہ کریں۔[۹]

ڈاکٹر فیروز احمد ایک اچھے عہدے پر فائز ہونے کے علاوہ تحقیق و تدوین کے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ زندگی میں بہت سے طلبہ و اسکالرز کی انھوں نے رہنمائی کی ہو گی۔ انھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ تدوینی کاموں میں تحقیقی شواہد کا ہونا لازم ہے۔ قیاسی باتوں پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ وہ خود لکھتے ہیں: ''کہ مرزا حامد بیگ نے کوشش کی ہے''۔ کوشش میں کامیابی اور ناکامیابی دونوں صورتیں ہو سکتی ہیں۔ وہ اپنی کوشش میں کامیاب تو نہیں ہوئے نا؟''

فیروز صاحب اپنے مطبوعہ نسخے کے صفحہ ۱۳ کے شروع میں لکھتے ہیں ''کہ رشید حسن خاں نے مرزا حامد بیگ کے تمام معروضات کو رد کر دیا ہے۔''[۱۰] انھوں نے اس سلسلے میں جو انداز اختیار کیا ہے وہ بلاشبہ جارحانہ ہے لیکن رشید حسن خاں یہ نہیں بتا سکے کہ مرزا حامد بیگ نے ستۂ شمسیہ مطبوعہ ۱۲۵۳ھ (مطابق ۳۷۔۱۸۳۶ء) حیدر آباد کے ترجموں میں جس میر امان علی دہلوی کے نام کو شامل ہونے کا ذکر کیا ہے، وہ اگر میر امّن نہیں تو کون بزرگ ہیں؟''

اگلے اقتباس میں خود تسلیم کرتے ہیں کہ ''ہمیں بھی اِن بزرگ کے متعلق کچھ علم نہیں''۔

ڈاکٹر فیروز احمد جب اپنا نسخۂ جے پور مرتب کر رہے تھے تو اُس وقت رشید حسن خاں صاحب کا مرتب کیا ہوا نسخۂ باغ و بہار ان کے سامنے موجود تھا۔ انھوں نے خود اس کا نام ''نسخۂ جدید ۱۹۹۲ء'' رکھا تھا، تو کیا وجہ ہے کہ اس نسخے میں میر امّن کے ''حالاتِ زندگی'' کے تحت انھوں نے اُن صفحات کو کیوں نہیں دیکھا جن میں خاں صاحب نے مرزا حامد بیگ کے معروضات کو غلط ثابت کیا ہے؟

چلیے فیروز احمد صاحب کی نظر وہاں نہیں پڑی تو ہم خاں صاحب کی تحریر سے چند باتیں یہاں درج کر دیتے ہیں:

''رسالۂ نقوش (لاہور) کے خاص نمبر (دسمبر ۱۹۸۷ء) میں مرزا حامد بیگ صاحب نے ''میر امّن دِلّی والے'' کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا ہے، جس میں بے بنیاد قیاسات پر درج مضمون تفصیلات کی بنیاد رکھی ہے، اس کے نتیجے میں وہ بہت آسانی اور روانی کے ساتھ بہت سی باتیں لکھتے چلے گئے۔ مثلاً یہ کہ میر امّن جب دہلی سے نکلے ہیں ''اُس وقت اُن کی عمر تیرہ برس رہی ہو گی، یوں ۱۷۵۰ء کے لگ بھگ میر امّن پیدا ہوئے ہوں گے''۔ اس تعین کی ضرورت مقالہ نگار کو یوں پیش آئی کہ انھوں نے یہ لکھا ہے کہ میر امّن بڑھاپے کے سبب سے فورٹ ولیم کالج سے ریٹائر نہیں کیے گئے تھے [جیسا کہ عتیق صدیقی نے معتبر حوالے سے لکھا ہے] بل کہ ''گمانِ غالب ہے کہ میر امّن نے کالج کے بگڑتے ہوئے حالات کے پیشِ نظر بروقت حیدر آباد کا رُخ کیا ہو''۔ اور یوں مقالہ نگار نے نہایت آسانی کے ساتھ میر امّن کو نواب شمس الامراء کے قائم کردہ ''دار الترجمہ'' میں پہنچا دیا، جہاں وہ مختلف سائنسی کتابوں کے ترجمے میں شریک رہے۔ ان سب بے بنیاد اور قطعی طور پر ناقابلِ قبول قیاسات کی بنیاد دار الترجمہ کی ایک کتاب ستۂ شمسیہ پر رکھی گئی ہے، جس کے مقدمے میں نواب شمس الامراء نے لکھا ہے کہ ''میر امان علی دہلوی اور غلام محی الدین حیدر آبادی۔۔۔ جو ملازمانِ سرکار ہیں، حکم کرنے میں آیا کہ ان علومِ مذکورہ کو زبانِ انگریزی سے اردو زبان میں ہمارے روبرو ترجمہ کریں''۔ مقالہ نگار نے یہ فرض کر لیا کہ ''میر امان علی دہلوی'' کوئی اور نہیں، میر امّن دلّی والے تھے: ''زمانی اعتبار سے بھی میر امان علی، میر امّن بھی ہو سکتے ہیں۔ نیز امّن مکمل نام نہیں، تخلص معلوم ہوتا ہے، اور یہ تخلص میر امان علی ہی کا موزوں تر ہے''۔[۱۲] اِس لیے ضروری تھا کہ کم از کم ۱۸۴۰ء تک میر امن کو زندہ رکھا جائے، [ستۂ شمسیہ کا دیباچہ میر امّن کو ۱۸۴۰ء تک حیات ثابت کرتا ہے''[۱۲] اس کی صورت انھیں یہ نظر آئی کہ فرض کر لیا جائے کہ وہ ''۱۷۵۰ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے ہوں گے''۔ مقالہ نگار نے اپنے طویل مقالے میں میر امّن سے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اُس میں سے کوئی ایک بات بھی قابلِ قبول نہیں اور اس کی اصل وجہ وہی ہے کہ قیاسات کی بنیاد مفروضات پر رکھی گئی ہے''۔[۱۳]

اب تو ڈاکٹر فیروز احمد مرزا حامد بیگ صاحب کے قیاسی و بے بنیاد مفروضات سے متعلق اچھی طرح جان چکے ہوں گے کہ ''میر امان علی دہلوی'' کون بزرگ ہیں؟ انھوں نے اپنے مطبوعہ نسخۂ جے پور کے صفحہ ۱۳ پر مرزا حامد بیگ صاحب سے متعلق رشید حسن خاں صاحب کے اندازِ تحریر کو یوں درج کیا ہے، ''اِنھوں نے اس سلسلے میں جو انداز اختیار کیا ہے وہ بلاشبہ جارحانہ ہے''۔

کیا کسی سے تحقیق کے میدان میں اختلاف کرنا ''جارحانہ'' ہو سکتا ہے؟ ادب میں اگر اختلاف نہیں ہوگا تو اچھا ادب کیسے وجود میں آئے گا۔

مرزا حامد بیگ نے میر امن کو فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے نکلنے کے بعد سیدھا نواب شمس الامراء کے دارالترجمہ میں پہنچا دیا۔ اس دارالترجمہ اور نواب کے سنگی چھاپے خانے سے سائنس سے متعلق جو اولین کتاب شائع ہوئی اُس کا نام ہے ''رسالہ علم ہیت'' جس کی اشاعت ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۳۴ء ہے۔ ''دلّی میں انگریزوں کی جانب سے قائم کردہ دہلی کالج (۱۸۲۴ء) کی کارکردگی کے دس سال کے اندر ہی حیدرآباد کے شمس الامراء نے علمی و فنی ترجمہ اور اشاعت کی خصوصیات کو عام کرنا شروع کر دیا تھا''۔[۱۴]

ان شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ ۱۸۳۴ء میں ''دارالترجمہ'' قائم ہوا اور میر امان علی دہلوی عرف میر امن اس میں ملازم ہوئے۔ جون ۱۸۰۶ء میں ایک انگریز کی شکایت اور اپنی پیرانہ سالی اور جسمانی معذوری کی وجہ سے سبک دوش ہوئے جب کہ مرزا حامد بیگ نے اس کی وجہ کالج کے بگڑتے ہوئے حالات کو ظاہر کیا ہے اور اسی بات کو ڈاکٹر فیروز احمد نے بھی تسلیم کیا ہے۔ کالج سے سبک دوشی کے وقت مرزا حامد بیگ کی تحریر کے مطابق میر امن کی عمر اس وقت قریب چھپن برس رہی ہوگی۔ ۱۸۰۶ء اور ۱۸۳۴ء کے درمیان ۲۸ سال کا لمبا عرصہ ہے۔ اس دوران میر امن کہاں رہے، اس کے بارے میں مرزا حامد بیگ اور ڈاکٹر فیروز احمد خاموش ہیں۔ کلکتہ پہنچنے سے قبل میر امّن نے اپنے کنبے کے دس افراد کو عظیم آباد چھوڑا تھا۔ اُن پر کیا گزری اُن کی کفالت کس نے کی اس کا مرزا حامد بیگ کی کتاب میں کوئی ذکر نہیں۔

مرزا حامد بیگ نے اپنے مرتبہ باغ و بہار میں چند ایسے شواہد پیش کیے ہیں جن کے تحت میر امن ۳۷-۱۸۳۶ء تک زندہ تھے۔ انھی شواہد کو ڈاکٹر فیروز احمد اپنے مطبوعہ نسخے کے ص ۱۵ پر یوں قلم بند کرتے ہیں:

''رام بابو سکسینہ نے تاریخ ادب اردو، کے حصۂ نثر سے متعلق باب اوّل میں میر امّن سے متعلق آخری سطر میں لکھا ہے: ''ڈاکٹر ایس، ڈبلیو فیلن نے خود میر امّن کی زبانی سنا تھا کہ ان کو کسی سے فنِ شعر میں تلمذ نہیں''۔ میر امّن سے متعلق فیلن کی ملاقات کا حوالہ محمد یحییٰ تنہا نے بھی سیر المصنفین میں دیا ہے۔ یاد رہے کہ ایس، ڈبلیو

فیلن کی پیدائش ۱۸۱۷ء بہ مقام کلکتہ ہے۔ اس نے ۱۸۳۷ء میں بیس برس کی عمر میں محکمہ تعلیم، بنگال میں ملازمت اختیار کی۔ اب اگر فیلن نے یہ کہا کہ اس نے میر امّن کی زبانی سنا تو اپنی پیدائش ۱۸۱۷ء سے قبل یا پیدائش ۱۸۱۷ء کے فوراً بعد وہ میر امّن سے بات کرنے سے رہا۔ اس کے میر امن سے بات کرنے کا زمانہ کیا رہا ہو گا؟ کیا ۳۷۔۱۹۳۶ء (اصل ۳۷۔۱۸۳۶ء) ہی ممکن نہیں؟ یوں ۳۷۔۱۹۳۶ء (اصل ۳۷۔۱۸۳۶ء) تک میر امن کے حیات ہونے کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو گا؟[۱۵]

ڈاکٹر فیروز احمد ایک محقق و مدون بھی ہیں، ان کے اس جملے پر غور کیجیے "میر امن سے متعلق آخری سطر میں لکھا ہے "تاریخ ادب اردو کا کون سا ایڈیشن ہے اور اس کا صفحہ نمبر کیا ہے؟ یہ بتانے کی زحمت انھوں نے گوارا نہیں کی۔ قاری تلاش کرتا پھرے یہ اس کا دردِ سر ہے۔

رام بابو سکسینہ صاحب نے فیلن کی بات کو میر امن کے حوالے سے درج ضرور کیا مگر حوالہ انھوں نے بھی نہیں دیا ہے۔[۱۶]

اب محمد یحییٰ تنہا نے جو کچھ سیر المصنفین میں درج کیا ہے اُس سے متعلق رشید حسن خاں صاحب کے خیالات کو سنیے۔

ممتاز حسین صاحب کا مرتب کیا ہوا نسخۂ باغ و بہار پہلی بار ۱۹۵۸ء میں کراچی سے شائع ہوا تھا۔ اُس کے مقدمے میں مرتب نے میر امن کا سالِ وفات (۱۲۱۷ھ) بھی لکھا تھا۔ اصل میں اِس کی اطلاع مفتی انتظام اللہ شہابی نے نصر اللہ خاں خوارجی کے تذکرہ گلشنِ ہمیشہ بہار اور مواقیت الفواتح کے حوالے سے ممتاز حسین صاحب کو بہم پہنچائی تھی۔ رشید حسن خاں نے ۱۹۶۳ء میں رضا لائبریری رام پور میں گلشنِ ہمیشہ بہار کو ڈھونڈ نکالا، اُس میں میر امن کا کوئی ذکر نہیں اور مواقیت الفواتح نام کی کوئی کتاب بھی انھیں کہیں دست یاب نہیں ہوئی مفتی انتظام اللہ شہابی نے یہ جعلی اطلاع ممتاز حسین صاحب تک پہنچائی تھی اور انھوں نے بغیر تحقیق کے اسے درج کتاب کر لیا۔ ان کے بعد آنے والے حضرات اسی بات کو دہراتے رہے۔

کریم الدین پہلے شخص ہیں جنھوں نے میر امّن کا نام میر امان اور تخلص "امّن" لکھا ہے۔ مولوی محمد یحییٰ نے سیر المصنفین میں میر امّن کا نام میر امان اور دو تخلص "امّن" و "لطف" درج کیا ہے[۱۷] اس کے بعد مولوی سید محمد نے اپنی کتاب اربابِ نثر اردو اور ڈاکٹر سہیل بخاری نے اپنے تحقیقی مقالے "اردو داستان: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ،[۱۸] سالِ طبع مارچ ۱۹۸۷ء میں اسی بات کو دہرایا ہے"۔[۱۹]

مذکورہ بالا اہلِ قلم نے جو کچھ بھی اپنی کتابوں میں درج کیا وہ رشید حسن خاں صاحب کی تحقیق کے مطابق بے بنیاد ہے اور انھیں کسی بھی صورت میں قبول نہیں کیا جا سکتا۔

اب مرزا حامد بیگ کی بات کو سامنے رکھیے کہ ۳۷۔۱۸۳۶ء میں میر امن کی ملاقات فیلن سے کلکتہ میں ہوئی اور اس ''بڑے ثبوت'' کو ڈاکٹر فیروز احمد نے مان کر اپنی کتاب میں درج کر لیا۔ اِس وقت میر امّن کی عمر ۸۶ برس کی ہو جاتی ہے۔ یعنی ۱۸۰۱ء سے ۳۷۔۱۸۳۶ء تک وہ کلکتہ ہی میں رہے۔ قریب ۳۷ برس وہ اپنے اہل و عیال سے دور رہے۔ کوئی بھی ذی ہوش اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا۔ اتنے عرصے تک وہ کلکتہ میں کیا کرتے رہے۔

میر امّن جون ۱۸۰۶ء کو اپنی پیراں سالی و جسمانی معذوری کی وجہ سے فورٹ ولیم کالج کی ملازمت سے سبک دوش ہوئے تھے۔ فرض کیجیے اس وقت ان کی عمر ۶۰ برس کی رہی ہو تو اس میں ۳۰ برس اور جمع کیجیے تو ۳۷۔۱۸۳۶ء میں یہ ۹۰ کے ہو گئے ہوں گے، ۶۵ یا ۷۰ برس کے رہے ہوں تو ان کی عمر بالترتیب ۹۵ اور ۱۰۰ برس کی ہو گئی ہو گی۔ اگر اتنی عمر میں انھوں نے کلکتہ میں انتقال کیا ہو تو ان کا مدفن تو کہیں ہونا چاہیے تھا۔ ان شواہد کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ملازمت دارالترجمہ اور کلکتے میں اتنے لمبے عرصے تک کا قیام دونوں باتیں بے بنیاد ہیں۔ ان کا کسی قسم کا تعلق میر امّن سے نہیں ہے۔

اب ڈاکٹر فیروز احمد کا ایک اور اقتباس ان کے مطبوعہ نسخۂ جے پور کے صفحہ ۱۶ سے پیش کیا جاتا ہے ملاحظہ فرمائیں:

اب اگر یہ میر امان علی دہلوی جن کا ذکر مرزا حامد بیگ نے میر امّن کے طور پر کیا ہے، اصل میر امّن نہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ فیلن کا یہ بیان کسی دوسری شخصیت سے متعلق ہے؟ اس کا قیاسی جواب پیش نظر باغ و بہار کے ترقیمے میں پوشیدہ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوسری شخصیت امام علی اسدی کی ہے جو گردشِ زمانہ کی سختیوں کو جھیلتے ہوئے اغلباً کسی انگریز واقف کار کی مدد اور سفارش سے کمپنی بہادر کی ایک فوجی چھاؤنی بہ مقام ہانسی (موجودہ صوبۂ ہریانہ کا ایک اہم شہر) میں ملازم ہوئے۔ یہ ملازمت کس نوعیت کی تھی اس کا ہمیں کوئی علم نہیں، لیکن اِسی ملازمت کے دوران امام علی اسدی نے بپاسِ خاطر قرۃ العین احسان علی ایک خطّی نسخہ تیار کیا۔ یہ نسخہ جیسا کہ اُس کے ترقیمے سے ظاہر ہوگا، ۱۰ شوال ۱۲۴۷ھ (مطابق ۱۳ مارچ ۱۸۳۲ء) کا مکتوبہ ہے۔ اس زمانے تک باغ و بہار کے متعدد اردو اور انگریزی ایڈیشن شائع ہو چکے تھے۔ اس صورت میں اگر امام علی اسدی چاہتے تو اپنے بیٹے کے لیے کسی اردو ایڈیشن کو مہیا کر سکتے تھے۔ مگر موجود حالات میں انھوں نے ایسا نہیں کیا بل کہ باغ و بہار کا ایک قلمی نسخہ تیار کیا۔ اُن کے اس طرزِ عمل سے گمان ہوتا ہے کہ کہیں یہ امام علی اسدی خود میر امّن تو نہیں جو فورٹ ولیم کالج سے سبک دوش ہو کر ایک بار پھر مختلف شہروں کی خاک چھانتے ہوئے ہانسی پہنچے۔ اگر اس قیاس کو تسلیم کر لیا جائے تو میر امّن

اپنے اصل نام امام علی اسدی کے ساتھ ۱۸۳۲ء تک زندہ رہے اور نسخۂ جے پور کا کاتب کوئی اور نہیں بل کہ خود میر امّن ہے"۔[۲۰]

اِس اقتباس کی روشنی میں ہم چند باتوں کا ذکر کریں گے۔ ستۂ شمسیہ کے دیباچے کے مطابق میر امّن ۱۸۴۰ء تک بہ قیدِ حیات رہے۔ مرزا حامد بیگ نے ایس۔ڈبلیو۔ فیلن سے ان کی ملاقات اور ان کا زندہ رہنے کا ثبوت ۳۷۔۱۸۳۶ء تک کا پیش کیا ہے۔ اب ڈاکٹر فیروز احمد انھیں نسخۂ جے پور کی تکمیل ۱۸۳۲ء تک زندہ ثابت کرتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے اِن کی بات کو مان لیجیے جو قیاس پر مبنی ہے۔ (جب کہ تحقیق قیاس نہیں ثبوت مانگتی ہے)۔ مرزا حامد بیگ نے دہلی میں میر امّن کی پیدائش کو ۱۷۵۰ء لکھا ہے۔ جون ۱۸۰۶ء کو میر امّن کالج کی ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔ اس وقت اِن کی عمر ۵۶ برس تھی۔ وہ گردشِ زمانہ کی سختیاں جھیلتے ہوئے ہانسی پہنچے اور کسی انگریز کی سفارش سے کمپنی بہادر کی فوجی چھاؤنی میں ملازم ہو گئے۔ نسخۂ جے پور قلم بند کرنے سے دو سال قبل یعنی یہ ۸۰ برس کی عمر میں دوبارہ کمپنی کے ملازم ہوئے۔ جب حالات اِن کے حق میں موافق ہوئے تب انھوں نے نسخۂ جے پور کو لکھنا شروع کیا اور ۱۰ شوال ۱۲۴۷ھ مطابق ۱۳ مارچ ۱۸۳۲ء میں اسے مکمل کر ڈالا۔

ڈاکٹر فیروز احمد کو اِن کی ملازمت کی نوعیت کا بھی کچھ علم نہیں۔ تو کیا کمپنی بہادر کے لوگ اتنے کم عقل تھے کہ ۸۰ برس کے بزرگ کو اپنے ہاں ملازم رکھتے، جب کہ ان کی کوئی خاص حیثیت بھی نہیں تھی؟

اس بات کو کیسے مان لیا جائے کہ جب میر امّن فورٹ ولیم کالج کی ملازمت سے سبک دوشی کے بعد وہاں سے چلا ہو گا تو اُس کے پاس روایتِ اوّل کی نقل اور ۱۸۰۴ء کے مطبوعہ نسخے باغ و بہار کی ایک ایک جلد موجود نہیں ہوئی ہو گی۔ ساتھ ہی گنجِ خوبی کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ جلدیں بھی نہیں ہوئی ہوں گی کیوں کہ یہی اصل چیزیں تھیں جو میر امّن کا اصل سرمایہ تھیں جن کی وجہ سے انھیں شہرت نصیب ہوئی تھی۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ میر امّن یہ تمام چیزیں وہاں چھوڑ کر خالی ہاتھ نکلا ہو گا، اور بعد میں اپنے بیٹے کے لیے اُس نے باغ و بہار کے قصے کو دوبارہ قلم بند کیا ہو گا اور اس میں حذف و اضافے کیے ہوں گے۔ اُسے ہر وہ کبت، شعر، محاورہ، کہاوت اور عنوانات اتنی مدت گزر جانے کے بعد بھی اُسی ترتیب سے یاد رہے ہوں گے۔

ڈاکٹر فیروز احمد نے کسی بھی ایسے نسخے کا ذکر نہیں کیا جس کو بنیاد بنا کر امام علی اسدی نے نسخۂ ہانسوی کو قلم بند کیا تھا۔

دوسری بات فیروز احمد صاحب اپنے مطبوعہ نسخے کے ص ۱۳ پر لکھتے ہیں: "ہاں، مرزا حامد بیگ کا یہ کہنا درست معلوم ہوتا ہے کہ میر امّن کا نام میر امّن نہیں، یہ محض عرفیت ہے"۔ کیا امام علی اسدی کو اپنے نام کے ساتھ اپنی عرفیت اِس نسخہ میں درج نہیں کرنی چاہیے تھی؟

ڈاکٹر فیروز احمد نے اپنے مطبوعہ نسخے میں اس خطّی نسخے کے پندرہ صفحات کے عکس شامل کیے ہیں جن میں نسخے کے آغاز یعنی ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' اور ترقیمہ بھی شامل ہے۔ مگر بڑی ہوشیاری سے انھوں نے اس نسخے کے سرورق اور اس کے اندر کے صفحے کا عکس شامل نہیں کیا کیوں کہ سرورق واندر کے صفحے سے بات صاف ہو جاتی کہ کاتب نے اپنے بارے میں تفصیلاً یا مختصراً کچھ لکھا ہے یا نہیں۔ اگر یہ واقعی میر امّن کے قلم کا نسخہ ہے تو انھوں نے یہاں بھی اپنی روداد ضرور لکھی ہو گی کہ وہ کلکتہ سے کب نکلے اور کن کن مقامات سے ہوتے ہوئے یہاں وارد ہوئے۔ کن کی مدد سے انھیں کب کمپنی بہادر کی ملازمت ملی اور ان کا عہدہ کیا تھا۔ ڈاکٹر فیروز احمد نے ایسی بات کا ذکر نہیں کیا۔ ان شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ امام علی اسدی ہانسی کے باشندے تھے اور انھوں نے اپنے بیٹے کے لیے اس نسخے کو نقل کیا تھا۔

اب ایک اور شہادت پیش کی جا رہی ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ میر امّن ہی ان کا اصل نام تھا اور وہ ''لطف'' تخلص کرتے تھے۔

''گنج خوبی کے خطّی نسخے کے آخری صفحے کی آخری سطر میں میر امّن نے اپنے قلم سے '' میر امّن لطفؔ'' لکھا ہے اور باغ و بہار کے آخر میں جو قطعۂ تاریخ ہے، اُس کے آخری شعر میں بھی یہ تخلص آیا ہے:

تو کونین میں لطف پر لطف رکھ خدایا بہ حق رسول کبار

رشید حسن خاں صاحب نے جان گل کرسٹ کی ایک انگریزی کتاب کا حوالہ دیا ہے:

"The Strangers Infallible East India Guide"

جس میں حافظؔ کی ایک فارسی غزل کا میر امّن نے اُردو میں ترجمہ کیا اور مقطع میں اس نے ''لطف'' تخلص استعمال کیا ہے۔ غزل کا مطلع و مقطع دونوں ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

ہے اُوٹ جلوۂ جاں کی گلی بدن میرا خدا کرے کہ اُڑے خاک ہو یہ تن میرا
اٹھا تو ہستی کو حافظؔ کی آ کے از راہِ لطف کہ کوئی سنے نہ ترے سامنے سخن میرا[۲۱]

ان شواہد کے بعد شک کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ اِن کا نام میر امّن نہیں تھا یا ''امّن'' ان کی عرفیت تھی۔ ان کا پورا نام '' میر امّن لطفؔ'' تھا اور وہ میر امّن کے نام سے مشہور تھے۔

مطبوعہ نسخۂ جے پور ۲۵۶ صفحات کو محیط ہے۔ سرورق پر باغ و بہار، اِس کے مصنف میر امّن، سالِ نقل خطّی نسخۂ جے پور (۱۲۴۷ھ ۱۸۳۲ء) اور مرتب: ڈاکٹر فیروز احمد درج ہے۔ ص ۲ پر کتاب و مرتب کے نام کے علاوہ سالِ اشاعت ۱۲ دسمبر ۲۰۱۲ء، قیمت، صفحات کی تعداد، ناشر کا نام اور ملنے کے پتے درج ہیں۔ ص ۳ انتساب کے لیے مخصوص ہے اور یوں درج ہے (باغ و بہار کے عاشق عبدالوہاب خاں سلیم (نیویارک) کے نام۔ نیچے ڈاکٹر فیروز احمد کا نام درج ہے۔ ص ۴ فہرست عنوانات کا ہے۔

''حرفِ آغاز، ص ۵ تا ۸، میر امّن اور فورٹ ولیم کالج، ص ۹ تا ۱۶، ص ۱۷ پر 'ہار کولیس و لزلی لارڈ مارننگٹن اور ڈاکٹر جان گل کرسٹ کی تصویریں ہیں، ص ۱۸ پر فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی تصویر ہے، ص ۱۹ پر صرف ''مقدمہ'' درج ہے۔ اصل مقدمہ ص ۲۰ تا ۴۷ تک ہے۔ ص ۴۸ پر فہرست کتاب باغ و بہار کے ۲۲ عنوان درج ہیں۔ مرتب نے اسی صفحہ کے حواشی میں لکھا ہے کہ خطّی نسخہ میں ہر عنوان کے آگے ورق کا نمبر شمار بھی لکھا ہوا ہے، مگر مرتب نے مطبوعہ نسخے میں اس کا التزام نہیں رکھا۔ صرف عنوانات لکھ دیے ہیں۔ مطبوعہ نسخے میں 'خطّی نسخۂ جے پور' کے پندرہ صفحات کے عکس بھی شامل کیے گئے ہیں۔

مرتب کا جو مضمون بہ عنوان باغ و بہار کا ایک قدیم مخطوطہ ماہ نامہ کتاب نما نئی دہلی میں اکتوبر ۱۹۹۶ء، شمارہ نمبر ۱۰، جلد: ۳۶ کے ص ۹ تا ۲۱ پر شائع ہوا تھا اُسی کو حذف و اضافے کے ساتھ مقدمے میں شامل کر دیا ہے۔ مرتب نے اِس خطّی نسخے کی جن خصوصیات کا ذکر کیا ہے اب اُن سے متعلق کچھ گفتگو ہو گی۔

۱۔ مطبوعہ نسخۂ جے پور میں باغ و بہار طبع اول کے سرورق کا صفحہ شامل نہیں ہے اور نہ ہی اُس نسخے کا سرورق شامل ہے جس کو بنیاد بنا کر اسے نقل کیا گیا ہے۔ اصل میں خطّی نسخۂ جے پور کا سرورق اس مطبوعہ نسخے میں شامل کرنے کی زحمت مرتب نے گوارا نہیں کی کیوں کہ اس خطّی نسخے کی حقیقت سامنے آسکتی تھی۔ یہ تحقیقی و تدوینی اصولوں کی سراسر خلاف ورزی ہے۔ اگر یہ نسخہ واقعی میر امّن کے قلم سے نقل ہوا ہوتا تو سرورق پر اُن کا پورا نام اور اندر کے صفحے پر اُن کی مختصر روداد ضرور درج ہوتی جب کہ اس نسخے میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ اس نسخے میں عرضی میر امّن دلّی والے کی بھی نہیں ہے۔

۲۔ مرتب نے اُن دو صفحات کا عکس شامل کیا ہے جس کے پہلے صفحے پر ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' لکھا ہوا ہے۔ لیکن ان صفحات کے نمبر شمار عکس میں نظر نہیں آتے جب کہ مرتب نے مطبوعہ نسخے کے ص ۴۸ کے عنوان فہرست کتاب باغ و بہار کے حواشی میں یہ لکھا ہے ''خطّی نسخہ میں ہر عنوان کے آگے ورق کا نمبر شمار لکھا ہوا ہے''۔ اگر نمبر شمار سامنے ہوتے تو پتا چل جاتا کہ اِس سے قبل نسخے کے کتنے صفحات ہیں۔

۳۔ مطبوعہ نسخۂ جے پور کا آغاز صفحہ ۵۰ سے ہوتا ہے۔ صفحے کے اوپر ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کے اوپر ''وبہ نستعین'' اور نیچے دائیں ''رَبِّ یسر'' و بائیں ''وتمم بالخیر'' لکھا ہوا ہے۔ یہ تین چیزیں اصل نسخے میں نہیں ہیں۔ مرتب کو کسی قسم کا اضافہ کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

آغازِ متن کے پہلے پانچ صفحات کے مرتب نے پانچ عنوانات قائم کیے ہیں اور انھیں ''فہرست کتاب باغ و بہار'' میں یوں درج کیا ہے: ''حمد میں''، ''نعت میں''، ''سببِ ترجمہ میں''، ''احوال مترجم میں'' اور ''اردو کی حقیقت میں''۔ لیکن اصل متن میں انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ نئے عنوانات قائم کرنا مرتب کا کام نہیں ہے۔

۴۔ صفحہ ۳۰ کی ان دو سطروں پر غور کیجیے جو ڈاکٹر فیروز احمد نے یوں تحریر کی ہیں: ''اِسی طرح آغازِ قصہ'' کا جو عنوان نسخۂ جے پور میں ہے، اصل متن میں یہ اس طرح ہے ''شروع قصے میں'' یہی فارس کے نسخے میں بھی ہے''۔ مرتب نے خطّی نسخۂ جے پور کا جو عکسی صفحہ ۵۵ پر پیش کیا ہے اُس میں یہ عنوان سرخ روشنائی سے یوں درج ہے ''شروع قصّی کے''۔ اب ایک ہی عنوان کو قابلِ احترام مرتب نے تین طرح درج کیا ہے۔ ''اصل متن میں یہ اِس طرح ہے ''شروع قصے میں''۔ عنوانات کی فہرست ص ۴۸ پر ''شروع قصّہ میں'' اور مطبوعہ نسخے کے ص ۵۶ پر ''شروع قصّے کے'' تو نئے اسکالرز کے لیے ایسی باتیں الجھن کا باعث ثابت ہوتی ہیں۔ رشید حسن خاں کے مطبوعہ نسخۂ باغ و بہار (جلد سوم ۲۰۰۹ء، ص ۱۰، اصل متن) کے ص ۱۰ پر عنوان یوں درج ہے [۲۲] ''شروع قصّے کا''۔ حواشی کے ص ۲۷۴ پر انھوں نے لکھا ہے ''ک کے متن میں یہی عنوان ہے، (ص ۷)''۔

۵۔ مرتب وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے ''پہلے درویش کی سیر کا جو عنوان نسخۂ جے پور میں ہے (یعنی 'پہلے درویش کی سیر میں') وہ ن، ک، ف، اور ع جیسے نسخوں سے مختلف ہے۔ اِن چاروں میں یہ عنوان اس طرح ہے: ''سیر پہلے درویش کی''۔ نسخۂ جے پور ص ۳۱۔۳۰) لیکن نسخۂ جے پور کے عکس ص ۶۵ پر سرخ روشنائی سے یوں درج ہے ''سیر پہلی درویش کے''۔ مرتب نے مطبوعہ نسخۂ جے پور کے ص ۶۶ پر ''سیر پہلے درویش کی'' کا عنوان ہی درج کیا ہے، لیکن فہرست عنوانات میں انھوں نے ''پہلے درویش کی سیر میں'' لکھا ہے۔ یہ اختلاف کیوں؟ خطّی نسخے میں جو عنوان ہے وہی مطبوعہ نسخے کا بھی ہے۔ تو کیا خطّی نسخے کا عنوان درجِ فہرست نہیں ہو سکتا تھا؟

۶۔ ڈاکٹر فیروز احمد اپنے مطبوعہ نسخۂ جے پور کے ص ۳۱ پر یوں لکھتے ہیں: ''ک، میں دوسرے درویش کا عنوان یہ ہے ''سیر دوسرے درویش کی''، ظاہر ہے کہ یہ بھی نسخۂ جے پور سے مطابقت نہیں رکھتا''۔

خطّی نسخۂ جے پور کا عکس مطبوعہ نسخے کے ص ۱۰۵ پر دیا گیا ہے اِس کے دوسرے صفحے پر سرخ روشنائی سے جو عنوان درج ہے وہ یوں ہے ''سیر دوسری درویش کے'' اور اِس سے اگلے صفحہ ۱۰۶ پر یہی عنوان درج ہے ''سیر دوسرے درویش کی''۔ جو عنوان نسخہ 'ک' میں درج ہے وہی خطّی نسخے میں درج ہے تو پھر یہ ایک دوسرے سے مطابقت کیسے نہیں رکھتے؟

رشید حسن خاں صاحب کے نسخۂ باغ و بہار اشاعتِ سوم ۲۰۰۹ء کے اصل متن کے ص ۱۲۰ اور ص ۶۸ میں دونوں عنوان بالترتیب 'سیر پہلے درویش کی' اور 'سیر دوسرے درویش کی' درج ہیں۔ مرتب نے عنوانات کی فہرست ص ۴۸ پر ''دوسرے درویش کی سیر میں'' لکھا ہے۔ فہرست میں عنوان بدلنے کی بات ہم سمجھ نہیں پا رہے ہیں۔ تحقیق و تدوین کا یہ کون سا اصول ہے کہ خطّی نسخہ میں جو عنوان درج ہے اُسے ہی فہرستِ عنوانات میں نہیں لکھا جاتا جب کہ خطّی و مطبوعہ نسخے میں ایک ہی التزام رکھا گیا اور فہرست میں اسے بدل دیا گیا۔

مرتب کا خطّی نسخۂ جے پور سے متعلق جو تعارفی مضمون اکتوبر ۱۹۹۶ء میں ماہ نامہ، کتاب نما دہلی میں شائع ہوا تھا اُس میں ص ۱۳ پر فہرست کتاب باغ و بہار میں عنوانات کی تعداد ۲۲ ہے، لیکن ہر عنوان کے آگے خطّی نسخے کا صفحہ نمبر بھی درج ہے۔ مطبوعہ نسخے میں مرتب نے ایسا نہیں کیا۔ خطّی نسخے میں سرخ روشنائی سے جو عنوانات درج ہیں وہ ''فہرست کتاب باغ و بہار'' سے مطابقت نہیں رکھتے۔

۷۔ ڈاکٹر فیروز احمد نے نسخۂ جے پور کے کاتب کو قیاساً میر امّن بتایا ہے مگر کاتب کی قابلیت قابلِ رشک ہے، فہرست کتاب میں جو عنوانات قائم کرتا ہے انھیں اصل متن میں جگہ نہیں دیتا تو پھر عنوانات قائم کرنے کا مقصد کیا ہے؟ کیا ایسا کرنے سے خطّی نسخے کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے۔ یہ طریقہ کار تو الجھن میں ڈالنے والا ہے۔ دوسرے متن میں سرخ روشنائی سے لکھے ہوئے عنوانات اور فہرست میں درج عنوانات آپس میں میل نہیں کھاتے۔

۸۔ سیر دوسرے اور تیسرے درویش کے درمیان نسخۂ جے پور میں پانچ عنوانات فہرست کتاب باغ و بہار میں دیے گئے ہیں۔ ''بادشاہ شاہزادی بصرہ کے حال دولت میں''، ''شاہزادہ نیم روزگار و سوار کے احوال میں''، ''آزاد بخت کے احوال میں''، ''خواجہ سگ پرست کے حال میں'' اور ''بارہویں لعل کی حقیقت میں''۔ مگر ان میں سے صرف ایک مطبوعہ نسخے میں شامل کیا گیا ہے اور وہ ہے ''حقیقت بارہ لعل کی'' [۲۳] لیکن مرتب نے خطّی نسخہ کے ص ۹۳ کی تیسری سطر سے اِن الفاظ کو اٹھا کے عنوان بنا دیا ''حقیقت اُن بارہون لعل کے'' جب کہ خطّی نسخے کے عکس میں یہ الگ سے عنوان نہیں ہے۔ اس سے قبل کاتب نے جو عنوان قائم کیے ہیں انھیں سرخ روشنائی سے متن کے درمیان خالی جگہوں میں لکھا ہے۔ یہ عنوان مسلسل متن کے بیچ میں ہے۔ اس عنوان سے قبل چار عنوانات کے لیے مرتب نے مطبوعہ نسخے میں ایسا نہیں کیا ہے۔

۹۔ مرتب نے خطّی نسخے کا جو عکس مطبوعہ نسخے کے ص ۲۰۸ پر شامل کیا ہے اُس کے ایک صفحے کا نمبر شمار ۱۰۱ ہے۔ اس کے متن کے درمیان خالی جگہ میں سرخ روشنائی سے ''سیر تیسرے درویش کے'' درج ہے لیکن فہرست میں اِسے یوں درج کیا گیا ہے۔ ''تیسری درویش کی سیر میں''۔ مطبوعہ نسخے میں عکسی نسخے کے طرز کو بھی اپنایا گیا ہے۔

لیکن رشید حسن خاں صاحب کے مطبوعہ نسخے میں سیر دوسرے اور تیسرے درویش کے درمیان ایک عنوان یوں مندرج ہے ''سر گزشت آزاد بخت بادشاہ کی''۔ انھوں نے حواشی کے ص ۳۳۱ پر یہ وجہ بیان کی ہے۔ ''ک میں یہ عنوان موجود نہیں، عبارت مسلسل ہے، البتہ ف (اور غ) میں یہ عنوان موجود ہے۔ یہاں ف کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ اِس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ک کے آخر میں ایک صفحے پر فہرستِ مضامین بھی ہے، اور اُس میں اِس موقع پر یہ عنوان ملتا ہے: ''بادشاہ آزاد بخت کی حکایت''۔ اِس سے معلوم ہوا کہ اِس داستان کا عنوان علاحدہ سے قائم کیا گیا ہے [ہونا بھی یہی چاہیے تھا] ن میں اگرچہ اِس مقام پر عنوان موجود نہیں، مگر اگلے صفحے پر موجود ہے۔۔۔ ن میں عنوان کی عبارت یہ ہے: ''قصہ آزاد بخت بادشاہ کا''۔ اب صورت حال یہ سامنے آئی ہے کہ ن، ک، ف میں یہ ایک ہی عنوان اختلافِ الفاظ کے ساتھ اِس طرح ملتا ہے۔ ک: ''بادشاہ آزاد بخت کی حکایت''۔ ن: ''قصہ آزاد بخت بادشاہ کا''۔ ف: ''سر گزشت آزاد بخت بادشاہ کی''۔ یہاں ف کی عبارت کو ترجیح دی گئی ہے، اِس بنا پر کہ وہ شاملِ متن ہے''۔

آپ نے دیکھا کہ ایک عنوان کو مطبوعہ نسخے میں درج کرنے کے لیے رشید حسن خاں صاحب نے کتنے نسخوں سے شواہد پیش کیے ہیں جب کہ ڈاکٹر فیروز احمد نے عنوان ''حقیقت بارہ لعل کی'' سے متعلق کوئی حوالہ پیش نہیں کیا۔ یہ عنوان بھی تو خطّی نسخۂ جے پور کے متن میں شامل ہے۔ مرتب نے فہرست عنوانات اور متن کے عنوانات میں اختلافِ الفاظ کا بھی ذکر نہیں کیا کہ کاتب نے ایسا کیوں کیا؟

۱۰۔ مرتب نے خطّی نسخے کا عکس مطبوعہ نسخے کے ص ۲۲۸ پہ شامل کیا ہے اسے پہلے عنوانوں کی طرح سرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے: ''جوتھی درویش کی سیر''۔ یہاں اِس عنوان کو پہلے تین عنوانوں کی صورت میں نہیں درج کیا گیا۔ یہاں الفاظ میں اختلاف نظر آتا ہے۔ یہ عنوان فہرست کتاب کے عنوان کی صورت میں درج کیا گیا ہے: ''چوتھے درویش کی سیر میں''۔ مرتب نے صرف عنوان کے آخر میں ''میں'' کو ہٹا دیا ہے۔ یہاں عنوان کی ترتیب بدل دی گئی ہے لیکن مرتب نے اِس کی وجہ بیان نہیں کی ہے۔ تدوین کا قاعدہ ہوتا ہے کہ مطبوعہ نسخے میں جو طریقہ کار آپ اپنانا چاہتے ہیں اُس کی مقدمے میں وضاحت کر دی جاتی ہے۔ مرتب نے کسی بھی اصول کی پیروی نہیں کی۔

'تیسرے اور چوتھے درویش کی سیر' کے درمیان فہرستِ کتاب میں دو عنوان درج ہیں:

''نعمان سیاح کی حقیقت میں'' اور ''بہزاد خاں کی جواں مردی میں'' لیکن مطبوعہ نسخے میں اِن کا اندراج نہیں۔ 'چوتھے درویش کی سیر' کے بعد کے دو عنوان: ''آزاد بخت کی لڑکی کی حال مین'' اور ''ہر ایک عاشق معشوق کی نکاح اور ختم کتاب میں'' مطبوعہ نسخے میں نہیں ہاں مسلسل عبارت عکس میں موجود ہے۔ آخری صفحہ ۱۳۰ پر ترقیمہ درج ہے جس میں کاتب کا نام بھی ہے۔

ڈاکٹر فیروز احمد نے اپنے مطبوعہ نسخۂ جے پور کی ص ۲۹ پر چند خصوصیات درج کی ہیں ہم اِن پر تھوڑی سی نظر ڈالتے ہیں۔

۱۔ ک اور گ میں بالعموم امتیاز رکھا گیا ہے۔

ایسا نہیں نسخے کے آغاز کے صفحہ پر یہاں ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' لکھا ہے۔ اُسی صفحہ کے متن میں ک اور گ کو الگ الگ صورتوں میں لکھنے کے باوجود اس طریقہ کار پر پوری طرح عمل نہیں کیا گیا۔ اسی صفحہ کے نثری متن کے بعد جو اشعار درج ہوئے ہیں اُن میں پہلے شعر کے دوسرے مصرعے میں ''کر'' لکھا گیا ہے جب کہ یہ گر ہونا چاہیے تھا۔ مثلاً: حمد اُس کی کر لکھا چاہوں، تو کیا امکان ہے''۔ مرتب نے اپنے مطبوعہ نسخے کے ص ۵۰ پر خود گر لکھا ہے۔ سامنے والے صفحے کے دوسرے شعر کے پہلے مصرعے میں بھی یہ پابندی روا نہیں رکھی گئی مثلاً:

''جس کا ثانی اور مقابل ہی نہو یکا کہو''۔ ''یعنی نہ ہووے گا کھو''۔

۲۔ دو لفظوں کے حروف کو ملا کر لکھنے کی مثال موجود ہے لیکن بہت کم۔

یہ بات بھی پوری طرح درست نہیں۔ اِسی صفحہ پر لفظوں کو ملا کر لکھا گیا ہے، مثلاً:

'اُسکی' تین بار، 'جسکا'، 'جسکی'، 'اِسکا'، 'اُسکا'، 'جسکو' اور 'سبکو'۔

ص ۳۰ نمبر شمار دس پر مرتب لکھتا ہے کہ ''لوح سے تمت تک اندازِ تحریر میں یکسانیت اور پختگی کی وجہ سے کہا جا سکتا ہے کہ کاتب کوئی ایسا شخص ہے جو فورٹ ولیم کالج کے نظامِ اِملا سے باخبر ہے لیکن اُس کا پابند نہیں''۔ مرتب کی ان سطور سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ نسخۂ جے پور کا کاتب میر امّن نہیں بل کہ کوئی اور شخص ہے جو فورٹ ولیم کالج کے نظامِ املا سے باخبر نہیں بل کہ بے خبر ہے اُس نے کسی بھی صورت میں کوئی پابندی نہیں کی۔

جان گل کرسٹ نے فورٹ ولیم کالج سے کتابیں چھاپنے سے قبل ایک نظامِ املا مرتب کر لیا تھا۔ اُس کی نگرانی میں جتنی کتابیں اُس کے دور میں چھپی تھیں اُن میں سختی سے اِس کے نظامِ املا کی پابندی کی گئی تھی۔ اُس کو سب سے زیادہ خیال اپنے نووارد انگریز طلبہ کا تھا جنھیں اردو زبان سیکھنی تھی۔

خطّی نسخۂ جے پور کے متن میں لفظ کے آخر میں واقع یائے معروف و مجہول کے امتیاز کو مطلقاً ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ دونوں کے لیے یائے معروف کا ہی استعمال کیا گیا اوّل تا آخر۔ صرف متن میں یہاں سرخ روشنائی سے عنوان قائم کیے ہیں ان میں ''کے'' میں یائے مجہول کا استعمال ہوا ہے، مگر اِس کی ادائیگی یائے معروف کے طور ہی کی گئی ہے۔ سوائے ''شروع قصے کے'' یہی احوال ہائے ملفوظ و ہائے مخلوط کی صورت میں ہے امتیاز یہاں بھی نہیں رکھا گیا۔ صرف جو عکس مرتب نے اپنے مطبوعہ نسخے کے آخر میں شامل کیا ہے اُس میں ترقیمہ سے پہلے جو بارہ اشعار ہیں اُن میں پہلے شعر

کے پہلے مصرعے میں، دوسرے شعر کے دوسرے مصرعے میں اور تیسرے شعر کے دوسرے مصرعے میں ''بہار'' کے بجائے ''بھار'' لکھا ہے۔ یہاں ہائے ملفوظ کے بجائے ہائے مخلوط کا استعمال ہوا ہے لیکن ادائیگی اور معنی کی صورت ہائے ملفوظ ہی کی ہے۔

اگر نسخۂ جے پور کا کاتب میر امّن ہوتا، جیسا کہ ڈاکٹر فیروز احمد نے قیاساً ثابت کرنے کی کوشش کی ہے تو ۲۸ سال گزرنے کے بعد بھی اِس نسخے کو نقل کرتے ہوئے فورٹ ولیم کالج کے نظام املا کی تھوڑی بہت پابندی لازمی طور پر کرتے۔ کیوں کہ وہاں انھوں نے اپنی دو کتابیں باغ و بہار اور گنجِ خوبی ڈاکٹر جان گل کرسٹ کی نگرانی میں قلم بند کی تھیں۔

فیروز صاحب نے خطّی نسخۂ جے پور کے جتنے عکس اپنے مطبوعہ نسخے میں شامل کیے ہیں اُن کے متن کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پیراگراف کا کہیں بھی التزام نہیں رکھا گیا۔ کاتب رموز و اوقاف سے بھی واقف نظر نہیں آتا، وہ مسلسل لکھتا چلا جارہا ہے۔ متن میں کہیں بھی سکتہ یعنی چھوٹا ٹھہراؤ ،(Comma) وقفہ یعنی ٹھہراؤ ؛(Semicolon)، ختمہ یعنی مکمل ٹھہراؤ (Full Stop) اور فجائیہ، ندائیہ (Note of Exclamation) کی کوئی نشانی نہیں اور نہ ہی اضافت کے زیر کا استعمال ہوا ہے۔

باغ و بہار میر امّن کی اشاعت اول ۱۸۰۴ء میں منظر عام پر آئی جس میں مذکورہ بالا نظامِ املا کی پابندی کی گئی تھی۔ اِس کے ٹھیک ۲۸ سال بعد خطّی نسخۂ ہانسی کاتب نے نقل کیا۔ اِس نے فورٹ ولیم کالج کے نظامِ املا کے کسی بھی اصول کو مدِ نظر نہیں رکھا تو اس سے صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ باغ و بہار کی مطبوعہ اشاعتِ اول اُس کے سامنے نہیں تھی۔ ڈنکن فاربس کے نسخے کا اِس کے سامنے ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی اشاعتِ اول ۱۸۴۶ء لندن کی ہے۔ اِن ۲۸ سالوں کے عرصے میں کسی اور خطّی نسخے کی نشان دہی بھی نہیں ہوئی۔ اس نسخے کی نقل کے لیے کاتب نے پھر کس مطبوعہ یا غیر مطبوعہ نسخے کو بنیاد بنایا ہوگا۔ مرتب اِس سے متعلق کوئی سراغ مہیا نہیں کرواتا بل کہ خاموش ہے۔ مرتب نے کاتب کے حالاتِ زندگی بھی تلاش کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ نیشنل آرکائیو آف انڈیا دہلی میں کمپنی بہادر کے پورے زمانے کا ریکارڈ موجود ہے۔ ہانسی کی چھاؤنی کا ریکارڈ وہاں تلاش کرنے سے مل سکتا تھا۔ اُس میں امام علی اسدی کی ملازمت کی نوعیت کا آسانی سے پتا چل سکتا تھا۔

آپ حضرات کو معلوم ہونا چاہیے کہ ۱۸۳۲ء کے قریب انگریز پوری طرح شمالی ہند پر قابض ہو گئے تھے۔ اسی سال انھوں نے ہندوستان میں فارسی کی جگہ اردو کو دفتری زبان قرار دیا تھا۔ حکومت کا یہ آرڈر بھی آرکائیوز میں محفوظ

ہے۔ کیا وجہ ہے کہ ہانسی چھاؤنی کا ریکارڈ دست یاب نہ ہو پائے۔ مطبوعہ نسخے کے ص ۳۰ کے نمبر ۱۲ پر مرتب لکھتا ہے کہ ''نسخۂ جے پور میں کوئی فرہنگ نہیں لیکن دو تین الفاظ کے معنی حاشیے میں درج ہیں''۔

کاتب نے ایک سو اسّی (۱۸۰) برس قبل اس نسخے کو نقل کیا تھا۔ وہ اِس میں فرہنگ شامل نہیں کر سکا تو کیا مرتب کو بھی تدوین کے دوران اُسی اصول پر عمل کرنا چاہیے تھا؟ بیسویں صدی کے آخر اکیسویں صدی کے شروع میں تدوین کے بہت سے اصول بدل گئے ہیں جن پر عمل کرنا ہر مدون پر لازم ہے۔ اگر تدوینی نسخے میں فرہنگ درج نہیں کی جائے گی تو قدیم الفاظ یا متروکات کے معنی دیکھنے قاری کہاں جائے گا۔ کیا اُس کے پاس قدیم و جدید لغات کا ذخیرہ موجود ہے کہ وہ مطالعہ کے دوران متن میں درج ایسے الفاظ کے معنی تلاش کرتا پھرے؟ سہل نگاری کی یہ اچھی مثال ہے۔

مرتب نسخۂ جے پور اور نسخۂ جدید (مرتبہ رشید حسن خاں ۱۹۹۲ء) کا مقابلہ کرنے کے لیے لکھتا ہے کہ ''ہمیں کم از کم اُن پانچ نسخوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا، جن سے رشید حسن خاں نے استفادہ کیا۔ ممکنہ حد تک اگر ابوالخیر کشفی، سلیم اختر اور مرزا حامد بیگ کے مرتبہ متون سے بھی استنباط نتائج کیا جائے تو یہ اور بھی زیادہ بہتر ہوگا۔ لیکن اوّل تو مقدمہ میں اِس کی تمام و کمال گنجائش نہیں، دوم یہ کہ ہمارا مقصد صرف اُس متن کو سامنے لانا ہے جو اپنی غایت کے اعتبار سے منشائے مصنف کا آئینہ دار ہے''۔[۲۴]

اس اقتباس میں درج اِس جملے پر غور کیجیے: ''ہمیں کم از کم اُن پانچ نسخوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا''۔ جن پانچ نسخوں سے مقابلہ کر کے رشید حسن خاں نے باغ و بہار کا نسخہ مرتب کیا اُن میں سے ایک بھی نسخہ ڈاکٹر فیروز احمد کے پاس نہیں۔ ورنہ یہاں انھوں نے ابوالخیر کشفی، سلیم اختر اور مرزا حامد بیگ کے متن سے حوالے دیے ہیں اُن میں سے بھی حوالے دیتے۔ آگے بھی آپ دیکھیں گے کہ ان تین حضرات کے مرتبہ متون سے کہیں کہیں حوالے دیے ہیں۔

ان نسخوں (جن کا ذکر اوپر اقتباس میں ہے) کے تقابل کا ذکر مقدمہ میں نہیں ہوگا تو کہاں ہوگا۔ اس کی گنجائش اس لیے نہیں کہ تقابلی مطالعہ صبر و تحمل کے علاوہ وقت مانگتا ہے جو کہ مرتب کے پاس نہیں۔ جب نسخۂ جے پور کا دوسرے نسخوں سے تقابل کیا ہی نہیں جائے گا تو ہم کیوں کر ثابت کر سکتے ہیں کہ جو نسخہ مطبوعہ صورت میں پیش کیا جا رہا ہے وہ منشائے مصنف کا آئینہ دار ہے۔

مرتب کی اس عبارت پر بھی غور فرمایئے گا: ''نسخۂ جے پور اور نسخۂ جدید (مرتبہ رشید حسن خاں ۱۹۹۲ء) کا متن یکساں نہیں، دونوں کے تقابلی مطالعے سے صاف ظاہر ہے کہ اختلافات بڑے اور بنیادی حیثیت کے حامل ہیں اور اگر ان کی درستگی نہ ہوئی تو ہم میر امّن کے ساتھ انصاف نہیں کر سکیں گے''۔[۲۵]

نسخۂ جے پور اور نسخۂ رشید حسن خاں کے متن میں یکسانیت کیسے ہو سکتی ہے۔ خاں صاحب نے سب سے پہلے ۱۹۶۴ء میں معیاری ادب کی سیریز کے تحت مکتبہ جامعہ کے لیے اسے تیار کیا تھا۔ مسلسل ۲۸ برس کی کوشش کے بعد ۱۹۹۲ء میں اس کی اشاعت منظر عام پر آئی۔ اس عرصہ میں انھوں نے باغ و بہار کی روایتِ اوّل، ہندی مینول، اشاعتِ اوّل ۱۸۰۴ء ڈنکن فاربس، مولوی عبدالحق کا نسخہ اور اپنے سے پہلے دوسروں کے مرتب کیے ہوئے نسخوں کے علاوہ فارسی کے اصل قصہ چہار درویش و بہت سے حضرات کے مضامین اس داستان سے متعلق جمع کیے۔ باغ و بہار میں آئے الفاظ کے معنی سے متعلق انھوں نے اردو، فارسی اور عربی کی بیس لغات سے استفادہ کیا جن کے نام اس مطبوعہ نسخے کے آخر ضمیمہ تشریات میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ مرتب نسخۂ جے پور اور نسخۂ جدید کے اختلافات کی درستی کر کے میر امّن کو انصاف دلانا چاہتا ہے۔ اس کے لیے فیروز صاحب نے چند مثالیں پیش کی ہیں آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

نسخۂ جدید کے صفحہ نمبر ۲۳۴ پر اور کشفی (ص ۳۰۳)، سلیم اختر (ص ۲۱۵) اور مرزا حامد بیگ (ص ۲۶۳) کے نسخوں میں ایک فقرہ اس طرح درج ہے:

''جو نسخہ لکھ دیتا، اُسی ترکیب سے بنا کر پلاتا، اور شولا اور غذا اپنے ہاتھ سے پکا کر نوالا بنا کر کھلاتا''۔

نسخۂ جدید کے اسی صفحے پر یہ فقرہ یوں درج ہے:

''جو نسخہ لکھ دیتا، اُسی ترکیب سے بنا کر پلاتا۔ اور شولا اور غذا اپنے ہاتھ سے پکا کر کوئی نوالا کھلاتا''۔

ڈاکٹر فیروز احمد نے فقرہ درج کرتے وقت حرکات و رموزِ اوقاف کا دھیان بالکل نہیں رکھا مثلاً: ''نُسخہ'' کے نْ پر پیش ہے، ''پِلاتا'' کے پ کے نیچے زیر ہے۔ ''شُولا'' کے ش پر پیش ہے، 'غذا' کے غ کے نیچے زیر ہے۔ اِسی طرح 'نِوالہ' کے نِ اور 'کھلاتا' کے کھ کے نیچے زیر ہے۔ 'پِلاتا' کے آگے ختمہ یعنی مکمل ٹھہراؤ (Fullstop) ہے۔ 'غذا' و 'اپنے' 'کر' و 'کوئی' کے درمیان کاما یعنی سکتہ نہیں آسکتا اِس لیے فصل رکھا گیا ہے تاکہ پڑھنے میں آسانی ہو۔

فیروز صاحب نے نسخۂ جدید سے یہ جو فقرہ درج کیا ہے اُس میں 'پلاتا' کے آگے سکتہ لگایا ہے، 'نِوالہ' کا املا بدل کر 'نوالا' کر دیا ہے۔ اتنے پر ہی بس نہیں انھوں نے نسخۂ جدید سے ''نِوالہ'' سے قبل لفظ ''کوئی'' کو حذف کر دیا اور ''نوالہ'' کے بعد ''بنا کر'' کا اضافہ کر دیا ہے۔ اکتوبر ۱۹۹۶ء میں کتاب نما دہلی میں جو اِن کا اِس نسخے سے متعلق تعارفی مضمون شائع ہوا تھا اُس کے ص ۱۴ کی ۲۳ ویں سطر میں ''نوالہ'' کا املا نسخۂ جدید کے مطابق ہے اور اِس سے قبل 'کوئی' بھی شامل ہے اور 'بنا کر' نہیں ہے۔ یعنی اُس وقت بھلے ہی فقرہ چھوٹا ہے حرکات کا استعمال نہیں ہوا ہے لیکن درست درج ہے۔

سولہ سال بعد نسخۂ جے پور مرتب ہوا تو اِس میں پچھلی خامیوں کو دور ہونا چاہیے تھا لیکن ان میں اضافہ ہوا۔ لگتا ہے مرتب نے وہی سولہ سال قبل والا مضمون مقدمے میں شامل کر دیا اور اسے کسی ہونہار شاگرد کے حوالے کر دیا اور اُس سے جیسا نقل ہو سکا کر دیا، اُس نے اسے سیدھا کاتب کے سپرد کر دیا۔ کاتب نے اپنی مرضی سے اسے کمپوز کر دیا اور بغیر پروف ریڈنگ کے یہ مسودہ پریس پہنچ گیا اور شائع ہو گیا۔ ایسی بہت سی باتوں کا ذکر آگے آئے گا۔

مرتب نے اپنے مطبوعہ نسخۂ جے پور میں یہ فقرہ یوں درج کیا ہے:

''جو نسخہ لکھ دیتا، اُسی ترکیب سے بنا کر پلاتا، اور شولا او غرا اپنے ہاتھ سے پکا کر کوئی نوالا کھلاتا''۔ (ص ۲۴۳)

یہاں مرتب یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ اس فقرے میں جو لفظ 'او غرا' استعمال ہوا ہے وہ زیادہ قرین قیاس ہے۔ اس کے لیے وہ یوں تحریر کرتا ہے:

''یہاں شولا (بہ معنی کھچڑی جو اِس قدر پکائی جائے کہ حریرہ کے مانند ہو جائے) کے ساتھ غذا، محل نظر بل کہ یکسر غلط بھی ہے۔

رشید حسن خاں نے ضمیمے میں صراحت کی ہے کہ 'ک' میں غذا کی جگہ 'اوغذا' ہے جو طباعت کی غلطی ہے۔ 'اوغذا' کو غلطی طباعت مان کر تھوڑی دیر کے لیے 'شولا' کو نظر انداز کر دیجیے اور مذکورہ بالا فقرہ پھر پڑھیے، یعنی غذا اپنے ہاتھ سے پکا کر نولا (یہ نوالا ہونا چاہیے، املا غلط ہے) بنا کر کھلاتا، کیا غذا پکانا خلاف محاورہ اور یکسر غلط اندازِ بیان نہیں ہے؟ آصفیہ میں لفظ 'او گرا' موجود ہے اور لغات کبیر (حصہ دوم) معروف بہ لغات الادویہ میں اِسے 'اُگرا' اور 'او گرہ' دونوں صورتوں میں درج کرتے ہوئے ہندی الاصل قرار دیا ہے اور جو معنی لکھے گئے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ 'اگرا' یا 'او گرہ' مریضوں کے لیے ایک غذائے رقیق کا نام ہے جو چاول، مونگ اور گرم مسالوں سے تیار کی جاتی ہے۔ اس معنی میں شولا (اصل شُلّہ) اور 'او گرا' کا تعلق ظاہر ہے۔ محولہ بالا نسخوں کے برخلاف نسخۂ جے پور میں اس مقام پر 'اوغرا' ہے اور یہ اصل سے قریب تر ہے، ممکن ہے کہ بول چال کی سطح پر 'او غرا' بھی مستعمل ہو۔ یوں بھی گ کی آواز کا غ میں بدل جانا (بول چال میں) قرین قیاس ہے۔ نسخۂ جے پور میں 'شولا' کی رعایت ہے، 'اُغرا' اسی بول چال کا مظہر ہے''۔ (ص ۳۳)

مرتب نے مطبوعہ نسخے کے ص ۲۴۳ پر 'شولا او غرا' لکھا ہے۔ اقتباس میں بحث کے دوران دو لُغات آصفیہ و الادویہ کے حوالے سے 'اُگرا' اور 'او گرہ' لکھ کر اِن کے معنی غذائے رقیق یعنی چاول، مونگ اور مسالوں سے تیار کی گئی ایک قسم کی کھچڑی بتایا ہے۔

پلیٹس کے لغت (۲۰۰۳۔۲۰۰۰) کے ص۱۰۶ پر ''او گرا'' دو بار لکھا ہے۔ دونوں کو ہندی میں ओगरा لکھنے کے بعد اسے سنسکرت بھی لکھا ہے اور اس کا ہجا शूल کیا ہے۔ معنی کھچڑی کے درج ہے لیکن ''اوغرا'' کسی لغت میں نظر نہیں آتا۔

پلیٹس کے ص۷۳۷ پر شولا م शूल عنی اینٹ کا بھٹّہ اور شولا शोला پانی پر تیرتا ہوا پودا درج کیا ہے۔ فیروز اللغات کے ص۶۴۷ پر ''شُلہ'' فارسی بہ معنی گوشت کے شوربے میں پکائے جانے والے چاول۔ کھچڑی۔

مرتب نے فقرے میں ''اوغرا'' لکھا جو آخر تک پہنچتے پہنچتے 'اُغرا' ہو گیا اور اسے قرین قیاس قرار دیتے ہوئے اصل سے قریب تر مانتے ہیں۔

کیا مرتب بتا سکتے ہیں کہ میر امّن کے عہد میں یا اُن سے قبل و بعد میں انھی معنی میں کسی اور قلم کار نے، کسی تذکرے، کتاب یا لغت میں اسے استعمال کیا ہے؟

مرتب ہر جگہ اپنی بات منوانے یا درست ثابت کرنے کے لیے ہمیشہ قیاس کا سہارا لیتا ہے۔ تحقیق قیاس کو قبول نہیں کرتی ثبوت مانگتی ہے۔

مرتب کے دوسرے اعتراض پر غور کیجیے جو انھوں نے نسخۂ جدید کے ص۲۲۶ پر درج فقرے پر لگایا ہے:

''۔۔۔ ایک کاغذ، دستگی سے نکال کر، میرے تئیں دکھلایا اور کہا: یہ جس شخص کی شبیہ ہے، اسے جہاں سے جانے، تلاس کر کے میری خاطر پیدا کر کے لا''۔ (مطبوعہ نسخۂ جے پور، ص۳۳)

رشید حسن خاں صاحب کے نسخۂ جدید میں یہ فقرہ یوں درج ہے:

''ایک کاغذ، دَستگی سے نکال کر، میر تئیں دِکھلایا اور کہا: یہ جس شخص کی شبیہ ہے، اُسے، جہاں سے جانے، تلاش کر کے میری خاطر پیدا کر کے لا''۔ (ص۲۲۶)

مرتب نسخۂ جدید کے فقرے کو درست نقل نہیں کر سکا۔ 'شبیہ ہے' کے بعد وقفہ یعنی سیمی کولن ہے جب کہ انھوں نے سکتہ لگایا ہے۔ اس کے بعد 'اسے' نہیں 'اُسے' ہے ساتھ ہی سکتہ یعنی کاما لگا ہے۔

مرتب نے اپنے مطبوعہ نسخے سے جو فقرہ درج کیا ہے، وہ یوں ہے:

''ایک کاغذ دستگی سے نکال کر میرے تئیں دکھلایا اور کہا یہ جس شخص کی تشبیہ ہے اسے جہان سے تلاش کر کے میری خاطر پیدا کر کے لا''۔[۲۶]

مرتب کا کمال دیکھیے اصل متن میں انھوں نے 'نکال کر'، 'تشبیہ ہے' اور 'تلاش کر کے' کے آگے سکتہ یعنی کاما تین جگہ استعمال کیا ہے جب کہ اوپر نقل شدہ فقرہ ان تین سکتوں سے خالی ہے۔ ایک ہی فقرہ صفحہ ۳۳ و ۳۴ پر

مختلف صورت میں درج ہے۔ اِس قسم کی کوتائی مدوّن کے لیے لازم نہیں۔ فقرے کی مختلف صورتیں قاری کے ذہن میں الجھن پیدا کرتی ہیں اور معنی بدل دیتی ہیں۔

مدون تدوینی اُصولوں کی ایک اور خلاف ورزی کرتا ہے۔ دوسروں کے نسخوں کے کہیں کہیں صفحہ نمبر لکھ دیتا ہے، مگر اپنے متن سے جو جملے یا فقرے درج کرتا ہے اُن کے صفحہ نمبر درج نہیں کرتا۔ یہ طریقۂ کار کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں۔ اِن فقروں کو تلاش کرنے کے لیے بہت سا وقت برباد ہوتا ہے۔ یہی طریقۂ کار سولہ سال قبل جب انھوں نے اس نسخے سے متعلق تعارفی مضمون ماہ نامہ کتاب نما دہلی میں شائع کروایا تھا اور یہی اِس متن کو شائع کرتے وقت جاری رکھا۔

وہ ''دستگی'' کو ''دستکی'' سے بہتر ثابت کرنے کے لیے یوں رقم طراز ہیں:

''رشید حسن خاں کے بموجب ن یعنی نسخۂ لندن میں 'دستکی' کی جگہ 'دستگی' ہے جب کہ غ، ف اور ک میں 'دستکی' ہے۔ 'تشبیہ' کا استعمال بھی تمام نسخوں میں ہے اور 'اسے جہاں سے جانے' کا ٹکڑا بھی عام طور پر سبھی مطبوعہ نسخوں میں موجود ہے''۔[۲۷]

نسخۂ جے پور اور مرزا حامد بیگ کے مرتبہ نسخے (کے ص، ۲۵۸) میں بھی ''دستگی'' ہے اِس لیے اِس لفظ کو ترجیح دی گئی ہے۔

فیروز اللغات (ص ۴۸۷، اشاعت ۱۹۸۲ء) اور پلیٹس (ص ۵۱۶، اشاعت ۲۰۰۳ء) دونوں میں 'دستکی' اور 'دستگی' دیے گئے ہیں۔ دونوں قریب ہم معنی ہیں۔

اب لفظ ''شبیہ'' سے متعلق مرتب کی رائے سُنیے: ''تمام نسخوں میں اسی شکل میں درج ہے، لیکن نسخۂ جے پور میں اِس کی جگہ ''تشبیہ'' واضح تر انداز میں لکھا گیا ہے۔ پورے نسخے میں صرف یہی ایک لفظ ہے جو بظاہر غلط معلوم ہوتا ہے اور ذہن کو متداولہ نسخوں میں درج ''شبیہ'' کی طرف متوجہ کرتا ہے، مگر کاتب کی احتیاط پسندی اور اس سے زیادہ میر امّن کے مختارات کا خیال کرتے ہوئے ہم نے 'شبیہ' کو بمعنی تصویر مرجح خیال کیا ہے، اِس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ جس مقام پر یہ لفظ آیا ہے اُس کے دو تین جملوں کے بعد ایک جملے میں لفظ تصویر بھی موجود ہے''۔[۲۸]

قابلِ احترام مرتب اِس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ ''تشبیہ'' کا لفظ غلط استعمال ہوا ہے پھر بھی وہ اِسے مرجح خیال کرتا ہے کیوں کہ میر امّن (قیاساً) نے اِسے خطّی نسخے میں استعمال کیا ہے۔ وہ ہر اُس نثری ٹکڑے یا لفظ کو درست مانتا ہے جو اِس خطّی نسخے میں موجود ہے۔

'شبیہ' اور 'تشبیہ' کے فرق کو چھٹے درجے کا وہ طالب علم اچھی طرح سمجھتا ہے جس کی تعلیم کا آغاز اردو زبان سے ہوا ہے۔

مرتب نے مذکورہ نثری ٹکڑے میں لفظ 'تلاش' سے متعلق لکھا ہے کہ باغ و بہار نسخۂ فیض اللہ (مرتبہ مرزا حامد بیگ) میں 'تالاش' کی صورت موجود ہے۔ نسخۂ جے پور میں تلاش، لفظ کی یہ شکل (یعنی تالاش) ایک جگہ موجود ضرور ہے، مگر اِس مقام پر نہیں۔ متن میں اسے دیکھا جا سکتا ہے''۔[۲۹]

مرتب کے تحقیقی اُصولوں کی داد دیجیے۔ نہ تو مرزا حامد بیگ اور نہ اپنے مطبوعہ نسخے کے صفحہ نمبر کا حوالہ دیا ہے۔ یہ آپ کی سر دردی ہے کہ پورے متن میں ''تالاش'' کو تلاش کرتے پھریے۔

مرتب نے نسخۂ جدید اور نسخۂ جے پور سے اختلافِ نثر کی ۳۳ مثالیں پیش کی ہیں۔ ہم ان میں سے چند پر اکتفا کریں گے۔ یہاں بھی مرتب کے تدوینی طریقہ کار کی داد دیجیے کہ نسخۂ جدید کے صفحات نمبر تو درج کیے ہیں مگر خود کے مطبوعہ نسخے سے ایک بھی صفحے کا نمبر نہیں لکھا۔ مطبوعہ نسخۂ جے پور کے متن میں سے ان نثری ٹکڑوں کو تلاش کرنے میں راقم کا بہت سا وقت ضائع ہوا ہے۔

نسخۂ جدید (رشید حسن خاں) ۱۹۹۲ء نسخۂ جے پور مکتوبہ ۱۲۴۷ھ ۱۸۲۳ء

نسخۂ جے پور مکتوبہ ۱۲۴۷ھ مطابق ۱۸۳۲ء ہونا چاہیے تھا جب کہ یہاں ۱۸۲۳ء درج ہے۔ جسے ہم کتابت کی غلطی نہیں مدون کی غلطی تصور کریں گے جنھوں نے پروف ریڈنگ کی ہی نہیں۔

۶۔ سوائے خدا کے شکر کے کچھ منہ سے نہ نکلتا تھا (ص ۴۸ نسخۂ جدید)

.....خدا کے.....ندارد[۳۰]

سوائے شکر کے کچھ منہ سے نہ نکلتا۔[۳۱]

کیا یہ جملہ درست ہے؟ کردار کس کا شکر کرتا ہے، اِس کے آخر میں ''تھا'' متن سے غائب ہے۔

۷۔ صراحی شربت کی تکلف سے بنا کر برف میں لگا کر لڑکے کے ہاتھ لوا کر آیا (نسخۂ جدید ص ۴۹)

اب رشید حسن خاں کا درج یہی نثری ٹکڑا دیکھیے۔

''ایک صراحی اُسی شربت کی تکلف سے بنا کر، برف میں لگا کر، لڑکے کے ہاتھ لوا کر آیا[۳۲]

مرتب نسخۂ جدید کو سامنے رکھنے کے باوجود اِس نثری ٹکڑے کو درست صورت میں نقل نہیں کر سکا۔ لفظ 'اُسی' اور دو کامے اِس جملے سے غائب ہیں۔ جو مدون کسی نسخے کے متن کو سامنے رکھتے ہوئے بھی اُسے اچھی طرح نقل نہیں کر سکتا اُسے تدوینی میدان میں قدم رکھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

مرتب کا نقل کردہ ٹکڑا دیکھیے: ''تکلف سے بنا برف میں لگا لڑکے..... '' [۳۳]

اب پورا جملہ ملاحظہ فرمائیں: ''ایک صراحی اسی شربت کی تکلف سے بنا، برف میں لگا، لڑکے کے ہاتھ لوا کر آیا''۔ اس ٹکڑے میں 'بنا کر' اور 'لگا کر' ہونا چاہیے تھا۔

میر امّن کی اشاعت اول میں ''کر'' جگہ جگہ اِس طرح آیا ہے کہ آج اُس میں اجنبی پن محسوس ہوتا ہے''۔ جیسے، حمدِ حق اور نعتِ احمد کو یہاں کر خدا کر جب صبح نزدیک ہوئی''۔ (نسخۂ جدید، ص ۱۲۷، مقدمہ) شاید مرتب نے اپنے مطبوعہ نسخے کے متن سے 'بنا' اور 'لگا' کے آگے 'سے کر' ہٹا دیا ہو اِسے اجنبی سمجھ کر۔

۹۔ جیسے شام کو شفق پھولے ہیں [۳۴]

اس جملے میں ''ہیں'' نہیں ''ہے'' ہے۔ مرتب نے غلط نقل کیا ہے۔ اب مرتب کے مطبوعہ نسخے میں یہی جملہ یوں نقل ہوا ہے:

''جیسے شفق پھولی ہے''۔ [۳۵]

۱۴۔ چڑھواں جوتا اڑایا (نسخۂ جدید، ص ۱۰۷)۔ اصل یوں ہے: چڑھواں جوتا اِڑایا۔

چڑھواں جوتا اڑایا یا [۳۶]

ڈاکٹر فیروز احمد اپنے مطبوعہ نسخے کے ص ۳۷ کے حواشی میں لکھتے ہیں:

''رشید حسن خاں نے لکھا ہے کہ ''اڑایا'' کی کہیں بھی مثال نہیں ملتی اور یوں واضح طور اِڑایا کو ترجیح حاصل ہے۔ (باغ و بہار ص ۳۲۸) صورت حال یہ ہے کہ اِس کی کم از کم دو مثالیں موجود ہیں''۔

مگر مرتب نے اِن میں سے ایک بھی مثال یہاں درج نہیں کی اور نہ رشید حسن خاں کے نسخۂ جدید کے ص ۳۲۸ کی پوری تفصیل پڑی ہے۔ اُس صفحے پر خاں صاحب نے جن کتابوں کا ذکر کیا ہے شاید مرتب نے وہ زندگی میں دیکھی ہی نہ ہوں۔

مرتب نے اِسی حواشی میں (نسخۂ فیض اللہ) مرتبہ مرزا حامد بیگ کے باغ و بہار کے ص ۳۱۵ کا حوالہ دیا ہے کہ اِس میں بھی 'اڑایا' ہی ہے لیکن فرہنگ میں 'اڑیایا' لکھا ہے۔

رشید حسن خاں صاحب ۳۱ جنوری ۱۹۸۶ء کو دہلی سے ڈاکٹر گیان چند جین کو اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''باغ و بہار کے دوسرے درویش کی کہانی میں، جہاں جوگی کا ذکر ہے، ایک جملہ یہ ہے:

''بالوں کا جوڑا باندھا۔ موچھوں پر تاؤ دے کر، چڑھواں جوتا اڑایا''۔ نسخۂ فارسی اور نسخۂ مولوی عبدالحق میں یہی ہے۔ نسخۂ فورٹ ولیم کالج میں ''اڑایایا'' ہے۔ یہاں واضح طور پر غلطی کتابت ہے۔ یا تو ''اڑایا'' ہوگا یا ''اڑیایا''

روایتِ اوّل کا جو عکس میرے سامنے ہے، اُس میں ''اڑیایا'' ہے۔ اگر مصدر ''اڑیانا'' مانا جائے تو اُس سے ''اڑیایا'' بنے گا (جیسے: گھگھیانا سے گھگھیایا) اور اگر ''اِڑانا'' مانا جائے تو ''اِڑایا'' بنے گا۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ اڑیانا یا اڑانا، جو تا پہننے کے معنی میں (ایڑی میں ڈالنا کی نسبت سے غالباً) کہیں آپ کی نظر سے گزرا ہے؟'' [۳۷]

رشید حسن خاں نے باغ و بہار کی تدوین کے دوران سینکڑوں لفظوں سے متعلق اپنے ہم عصر مشاہیر ادب سے پوچھنے میں شرم محسوس نہیں کی، مثلاً: ''چاہتیا''، ''بھائی چاری''، ''سُپنا'' ''وِتنا''، ''وِتنی''، ''پنڈت خانہ'' اور ''کوتوال کے ڈنڈے'' وغیرہ۔ جب انھیں پوری تسلی ہو جاتی تب وہ لفظ کو متن میں شامل کرتے اور اُس کا حوالہ ساتھ لکھ دیتے۔ مثال آپ کے سامنے ہے۔ ۱۹۸۶ء میں لفظ ''اِڑایا'' سے متعلق دریافت کر رہے ہیں اور کتاب ۱۹۹۲ء میں بے یک وقت ہندوستان و پاکستان سے شائع ہوتی ہے۔ اتنی محنت آج کے زمانے میں کون سا محقق و مدون کرے گا۔

مرتب نے نسخۂ جدید (رشید حسن خاں) ۱۹۹۲ء میں سے جو نثری ٹکڑے نمبر شمار و مع صفحات درج کیے ہیں اور اُن کا تقابل نسخۂ جے پور سے کیا ہے اُن میں سے درج ذیل نمبر شمار درست نقل نہیں ہوئے ہیں۔ یہ تدوین نگار کی سب سے بڑی خامی ہے۔ جو کسی نسخے کو سامنے رکھ کر اُس کے متن کو درست نقل نہیں کر سکتا وہ کسی خطّی نسخے کو مرتب کیا کرے گا، مثلاً یہ نمبر شمار: ۴ (ص ۲۰)، ۸ (ص ۴۹)، ۹ (ص ۵۵)، ۱۰ (ص ۷۲)، ۱۹ (ص ۱۴۷)، ۲۴ (ص ۱۸۷)، ۳۰ (ص ۲۲۱)، ۳۲ (ص ۳۹)۔

نمبر شمار ۵، ۱۳ اور ۱۶ (ص نمبر ۲۳)، (ص نمبر ۹۷) اور (ص نمبر ۱۱۲) پر موجود نہیں۔ ص نمبر ۱۱۲ والا نثری ٹکڑا (ص نمبر ۱۱۶) پر درج ہے۔ [۳۸]

اِسی طرح مطبوعہ نسخۂ جے پور کے ص ۴۱ پر جو مثالیں درج کی گئی ہیں اُن میں سے نمبر ۱ اور نمبر ۴ غلط نقل ہوئی ہیں۔ اِن مثالوں میں لفظوں کو بدل دیا ہے یا ترتیب بدل دی ہے۔ نسخۂ جدید میں سے نمبر ایوں درج کیا ہے:

''اشتیاق میں فرنگ کے ملک کے دیکھنے کو روانہ ہوا''۔ (جدید، ص ۲۰۶)

اصل اس طرح ہے: ''اِشتیاق میں فرنگ کے ملک کے دیکھنے کے، روانہ ہوا۔ (ایضاً)

اِس ٹکڑے میں تیسرے 'کے' کو 'کو' سے بدل دیا ہے۔ (نسخۂ جے پور میں یہ ٹکڑا ص ۲۱۹ پر ہے جب کہ مرتب نے اپنی کسی بھی مثال کا ص نمبر درج نہیں کیا ہے۔ یہ تدوینی اُصول کی سیدھی سیدھی خلاف ورزی ہے)

نمبر ۴ پر مرتب نے نسخۂ جدید (ص، ۲۲۰) سے جو مثال پیش کی ہے ملاحظہ فرمائیں:

''.....بولا کہ میں اس روز تمھیں اُس ظالم کے پاس لے گیا، کاش کہ اگر یہ جانتا تو نہ لے جاتا۔ میں نے گھبرا کر کہا: میرے جانے میں ایسی کیا قباعت ہوئی۔ کہو تو صحیح''۔

نسخۂ جدید کا اصل ٹکڑا یوں ہے:

''بُولا کہ میں اُس رُوز تمھیں اُس ظالم کے پاس لے گیا، کاشکے اگر یہ جانتا تو نہ لے جاتا۔ میں نے گھبرا کر کہا: میرے جانے میں کیا ایسی قباحت ہوئی، کہو تو صحیح!''

مرتب نے اِس نثری ٹکڑے میں سے ''تمھیں'' اور ''کاشکے'' کے املا کو بدل کر ''تمہیں'' اور ''کاش کہ'' کر دیا ہے۔ ''کیا ایسی'' کی ترتیب کو بدل کر ''ایسی کیا'' کر دیا ہے۔ یہ حق مرتب کو کس نے دیا ہے کہ آپ کسی کے متن کا املا بدل دیں۔

مرتب کہتا ہے کہ خطّی نسخۂ جے پور میں یہ نثری ٹکڑا یوں ہی درج ہے لیکن آخری لفظ 'صحیح' کی جگہ ''سہی'' لکھا ہے یعنی کہو تو سہی''۔[۳۹]

مرتب لفظ ''سہی'' کے حق میں جو تحریر درج کرتے ہیں ملاحظہ فرمائیں:

''یہ اور اِس طرح کے متعدد الفاظ جملے/فقرے بول چال، روز مرہ اور حسن بیان کے اعتبار سے ''نسخۂ جدید'' سے بہتر اور معنی خیز ہیں۔ یہاں پر یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ آخری جملے میں جو لفظ 'صحیح' آیا ہے اور وہ قطع نظر باغ و بہار (نسخۂ فیض اللہ)، کہ اِس میں ص ۲۵۵ پر 'کہو تو سہی' موجود ہے، دوسرے تمام نسخوں کے برعکس ''سہی'' کی صورت میں صرف نسخۂ جے پور میں پایا جاتا ہے، اور یہ بول چال کے استعمال کی عمدہ مثال ہے''۔[۴۰]

مرتب نے صرف خطّی نسخۂ جے پور اور نسخۂ فیض اللہ میں استعمال ہوئے لفظ ''سہی'' کو روز مرہ کی بول چال کی عمدہ مثال قرار دے دیا ہے جب کہ وہ خود اِس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اِن نسخوں سے قبل شائع ہونے والے سبھی نسخوں میں لفظ ''صحیح'' موجود ہے۔ مرتب نے اِس لفظ کے ثبوت میں نہ تو کسی لغت کا حوالہ دیا ہے اور نہ کسی کتاب کا جو اِس نسخہ سے پہلے شائع ہوئی ہو۔ مرتب نے اپنے مطبوعہ نسخے میں (ص ۷) یہ بات واضح کر دی تھی کہ فرہنگ اور حواشی کو اِس نسخے میں شامل کرنا ہمارے مقصد میں نہیں۔

مرتب کے پاس نسخۂ جدید (رشید حسن خاں) موجود تھا اور اُن کا مقصد یہ بھی تھا کہ جس طرح سے ہو سکے نسخۂ جے پور کو اُن کے نسخے سے بہتر ثابت کیا جائے۔ اِس لیے اِنھوں نے ایسے نسخوں کا سہارا لیا جنھیں وہ پہلے ہی ردّ کر چکے تھے۔

بڑی حیرانی کی بات ہے کہ مرتب نے نسخۂ جدید کا ضمیمہ نمبر ۲ بہ عنوان ''تلفظ اور املا'' کا ص نمبر ۵۲۹ کیوں نہیں دیکھا جس کے شروع میں ''صحیح'' لکھ بتایا گیا ہے کہ ''سب نسخوں میں اِسی طرح ہے۔ اصل لفظ بھی یہی ہے بعد کو یہ ''سہی'' میں بدل گیا''۔ انشا کی دریائے لطافت سے اور مولوی عبدالحق کی تحریریں پیش کی ہیں۔ پورا آدھا صفحہ اِس لفظ کی اصل اور بعد کی صورت سے متعلق صَرف کیا ہے۔

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ جنوری ۱۹۴۴ء میں اردو اِملا کمیٹی کا ایک اجلاس ناگ پور میں منعقد ہوا تھا۔ اُس میں بہت سے قدیم الفاظ کی صورتیں بدل دی گئی تھیں، مثلاً:

اردو میں اِس سے قبل ادنٰی، اعلٰی، صغریٰ، کبریٰ، مصطفٰی، وسطٰی اور اِسی قبیل کے بہت سے الفاظ کی یہی صورتیں تھیں۔ رشید حسن خاں کی کتاب ''اردو املا'' پہلی بار ۱۹۷۴ء میں شائع ہوئی۔ اُس کے بعد انجمن ترقی اردو ہند نے اور ہندوستان کے بہت سے ادبی اداروں نے اپنے قدیم طریقہ کار کو بدل کر ادنا، اعلا، صغرا، کبرا، مصطفا اور وسطا لکھنا شروع کر دیا۔ نصابی کتابیں اب اسی طرز پر تیار کی جاتی ہیں۔ اِس کے علاوہ اردو لغت بورڈ کراچی (پاکستان) نے جو ۲۲ جلدوں میں اپنا لُغت شائع کیا ہے اُس میں بھی اِسی طریقہ کار کی پیروی کی گئی ہے۔ اردو والوں کی دیکھا دیکھی ہندی والوں کا ''دیوناگری لپی سُدھار سمیلن ۲۸ اور ۲۹ نومبر ۱۹۵۳ء کو لکھنؤ میں منعقد ہوا جس میں حروف کی نئی اشکال کے استعمال پر زور دیا گیا، مثلاً शा । रा भ छ کو اب اس طرح لکھا جا رہا ہے शा ण झ छ अ اِن کے علاوہ اِن چار حروف ॡ ऌ کی جگہ صرف ایک حرف ऋ استعمال کیا جا رہا ہے۔ یہ وقت کی ضرورت ہے۔ بدلاؤ ہوتا رہتا ہے۔ ہم کسی کو معتبر اور کسی کو غیر معتبر قرار نہیں دے سکتے۔ باغ و بہار کی روایتِ اوّل، ہندی مینول اور اشاعتِ اوّل ۱۸۰۴ء تک کی ہیں۔ امام علی اسدی ہانسوی کا نقل کردہ نسخہ ۱۸۳۲ء کا ہے۔ ۲۸ برس کے لمبے وقفے میں ادب علاقائی اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مرتب کا خطّی نسخۂ جے پور کے تدوینی طریقہ کار میں اختلاف انھی کی زبانی سنیے:

''آخر میں اِس طریقہ کار کا ذکر ضروری ہے جو باغ و بہار کے نسخۂ جے پور کی ترتیب و اشاعت میں پیشِ نظر رہے۔

۱۔ ہائے ہوز [ہائے ملفوظی] سے لکھے گئے تمام الفاظ (بہ استثنائے انہیں اور اُنہیں) کو جدید املا میں درج کیا گیا ہے، مثلاً گھر (گہر)، ٹھینٹھ (ٹہینہٹہ) بھاکھا (بہاکہا) دھودھاکر (دہودہاکر) پیکھنے کا کھیل (پیکہنی کا کہیل) ٹھٹھولی (ٹہٹہولی) وغیرہ (ص ۴۴) اگر مرتب نے ہائے ملفوظی سے لکھے ہوئے کاتب کے الفاظ کو جدید املا یعنی ہائے مخلوط سے بدل دیا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ ''انہیں اور اُنہیں'' جیسے الفاظ کو اس طریقہ کار سے الگ رکھا گیا؟ مرتب نے انھی دو الفاظ کو ہی الگ نہیں رکھا بل کہ ''انہوں ص ۵۱، سطر ۱۹، اُنہوں ص ۱۴۳، سطر ۲۱، تمہارے ص ۷۰، سطر ۴، تمہاری سطر ۶، تمہیں ص ۷۱ سطر ۱، اور ص ۴۷ سطر ۴ پہ درج الفاظ کو بھی اِس طریقہ کار سے الگ رکھا۔ ایسا کیوں مرتب نے کیا اِس کی وجہ یا وضاحت کہیں نہیں کی ہے۔

۲۔ ''بعض الفاظ کے املا کی ایک سے زیادہ صورتیں ہیں۔ چناں چہ پیشِ نظر متن میں انھیں اصل کے مطابق ہی لکھا گیا ہے۔ مثلاً:

گذارش (بجائے گزارش)، ذرہ (ذرا)، اوڑہنی (اوڑھنی)، پانو (پانوں)، پکڑی (بجائے پگڑی) وغیرہ''۔ (ص ۴۵)

جب متن میں ایک ہی لفظ کی دو یا تین صورتیں ہوں گی تو طلبہ و نئے اسکالرز کا ذہن الجھے گا نہیں؟ وہ اگر کسی متن پر کام کرے گا تو کیا وہ بھی ایسا ہی طریقۂ کار اپنائے گا۔ مرتب اِن کے سامنے تدوین کا یہ کون سا اصول پیش کر رہا ہے؟ اِس کا فرض بنتا ہے کہ ان اختلافات کی حواشی یا مقدمے میں وضاحت کر دے اور ایک مرجح صورت متن میں درج کر دے۔

۳۔ ''خطّی نسخہ میں بالعموم زیر، زبر، پیش اور تشدید کا التزام موجود ہے۔ چناں چہ ہم نے اس کا خیال رکھتے ہوئے صرف اُن ہی لفظوں کو اصل کے مطابق لکھا ہے جن پر اعراب موجود ہیں، مثلاً: ''متعین'' لفظ پر اعراب کی دو واضح شکلیں ملتی ہیں۔ متعیّن اور مُتعیّن یا اسی طرح تعجّب اور تُعجّب یا پہر اور پَہر وغیرہ۔ متن میں ایسے تمام الفاظ کو اصل کے مطابق ہی لکھا گیا''۔ (ص ۴۵)

جن پر کاتب نے متن کے الفاظ پر اعراب و علامات کا استعمال کیا ہے اُنھی الفاظ کو اصل کے مطابق مرتب نے اپنے نسخے میں لکھا ہے چاہے اس کی دو صورتیں ہی کیوں نہ ہوں لیکن متن میں شامل باقی الفاظ پر مرتب نے انھیں لگانے کی زحمت گوارا نہیں کی اِس کی وجہ نہیں معلوم۔ ایسا نہ کرنے سے متن میں یکسانیت نہیں آئے گی اور الجھن برقرار رہے گی۔

۴۔ ''ہائے معروف و مجہول کے نقطۂ نظر سے چوں کہ خطی نسخے میں کوئی امتیاز نہیں برتا گیا ہے، اِس لیے ہم نے جدید طریقہ کتابت کا انداز اختیار کیا ہے تاکہ میری/میرے اور تمہاری/تمہارے جیسے الفاظ میں امتیاز ہو سکے''۔ (ص ۴۵)

یہاں بھی مرتب نے ایک اصول کی پابندی نہیں کی، مثلاً 'تمہاری' اور 'تمہارے' کا ذکر اِس سے قبل آچکا ہے۔ یہ جدید طریقۂ کار نہیں ہے۔

۵۔ خطّی نسخے میں ہر جگہ نَ موجود ہے۔ مثلاً کہاں، جہاں، کہاں، ہاں، نہیں، جو نہیں، وہ نہیں وغیرہ الفاظ میں نون کا اعلان ہے۔ ہم نے ایسے تمام مقامات پر موجودہ اِملے کی مطابقت اختیار کی ہے''۔ (ص ۴۶)

نون سے نقطہ ہٹانا سب سے آسان تھا اِس لیے مرتب نے یہاں جدید طریقہ اپنایا۔ باقی باتوں کے لیے محنت درکار تھی اِس لیے انھیں اصل کے مطابق ہی رہنے دیا گیا۔

۶۔ ''واؤ معروف و معدول کے لیے کسی طرح کا کوئی نشان یا علامت کا استعمال نہیں کیا گیا ہے''۔ (ص ۴۶)

جب کاتب نے ایسا نہیں کیا تو مرتب یہ زحمت کیوں اٹھاتا پھرتا۔

۷۔ خطّی نسخے میں جن الفاظ، اصطلاحوں، کہاوتوں اور محاوروں پر سُرخ روشنائی سے خط کھینچا گیا ہے، اُن کی نشان دہی کے لیے صرف اُن ہی الفاظ، اصطلاحوں، کہاوتوں اور محاوروں کو جلی حروف میں لکھا گیا ہے۔ اگرچہ چند محاورے/اور کہاوتیں اور بھی ہیں جن کو جلی حروف سے لکھا جا سکتا ہے مگر ہم نے اصل کی مطابقت کے خیال سے ایسا نہیں کیا''۔(ص۴۶)

یہاں بھی محنت و دقت کی ضرورت تھی اور یہی دو چیزیں مرتب کے پاس نہیں تھیں۔

۸۔ ''مخطوطے میں بعض الفاظ کو دو طرح سے لکھا گیا ہے۔ مثلاً: کلیجہ/کلیجا، بادشاہ/پادشاہ، تلاش/تالاش، اگھٹے/اکھٹے، خواص/خواض، قفس/قفص.... وغیرہ۔ پیش نظر باغ و بہار کے متن میں ایسے تمام مقامات پر اصل کی مطابقت اختیار کی گئی ہے''۔(ص۴۶)

کیا یہ طریقۂ کار قاری، طلبہ اور نئے اسکالرز کے لیے باعثِ پریشانی نہیں۔ وہ کس لفظ کو درست اور کس کو غلط سمجھیں گے۔ ص۵۸ پر سات بار 'پادشاہ'، ایک بار 'پادشاہت' اور ایک بار 'بادشاہ' متن میں آیا ہے۔ کیا اس صورت کو قبول کر لیا جائے؟ اِس کا جواب نفی میں ہے۔ موجودہ دَور کے تدوینی اُصولوں کی مطلق پروا نہیں کی گئی۔

۹۔ خطّی نسخے میں پیرا گرفنگ (Paragraphing) موجود نہیں اور نہ ہی رموزِ اوقاف اور ندائیہ کا کوئی قرینہ ہے۔ ہم نے اپنی فہم کے مطابق اِن کا استعمال کیا ہے''۔(ص۴۶)

کاتب کے زمانے کی بات کو الگ رہنے دیجیے، ہم میں سے بہت سے لوگ آج بھی اِن کی پابندی نہیں کر پاتے۔ ادبی ادارے ہوں یا یونی ورسٹیوں کے شعبۂ جات، اِن چیزوں پر کہیں بھی توجہ نہیں دی جاتی۔ تدوینی کاموں کے دوران اِن اصولوں پر عمل کرنا نہایت ہی مشکل کام ہے۔

نمبر شمار ۱، ۴ اور ۵ میں مرتب نے جدید املا کا انداز اپنایا جب کہ باقی کے لیے اصل کی مطابقت اختیار کی۔ تدوین کے دوران یہ دُہرا انداز اختیار کرنا جائز نہیں ہے۔ مرتب نے اپنی سہل نگاری کے لیے ایسا کیا ہے۔ اِس صورت میں نہ تو حواشی لکھنے پڑے ہیں اور نہ ہی ضمیمۂ تشریحات۔

نمبر شمار ۲ میں سے ہم دو لفظوں 'گذارش' (بجائے گزارش) اور 'تالاش' سے متعلق تھوڑی سی بات کرنا چاہتے ہیں۔

''ص۵۱ کی ۱۴ویں سطر میں 'گذارش' کا یوں استعمال ہوا ہے: 'اُن کی خدمت میں گذارش کرتا ہوں....'' اِس 'گذارش' کے معنی ہیں ہیں چھوڑنے کے، جب کہ اِس 'گزارش' کے معنی ہیں پیش کرنے کے۔ مثلاً 'نماز گذار' نماز چھوڑنے والا۔ نماز گزار، نماز پیش کرنے والا۔ موجودہ دَور میں اُردو املا میں بہت سے الفاظ کی صورتیں ہی نہیں بدلیں بل کہ معنی بھی بدل گئے ہیں۔ ''تالاش' سے متعلق پہلے بات ہو چکی ہے کہ اِس 'تالاش' کو لُغات میں تلاش

کرتے پھریے یہ آپ کو نظر نہیں آئے گی جب کہ مرتب بھی اِسے غلط تسلیم کر چکے ہیں مگر متن میں استعمال کیے جا رہے ہیں۔

اب تھوڑی سی گفتگو میر آمّن کی باغ و بہار اشاعتِ اوّل ۱۸۰۴ء کے املا سے متعلق کریں گے تاکہ یہ بات اچھی طرح صاف ہو جائے کہ خطّی نسخہ ہانسی/نسخۂ جے پور سے میر آمّن کا کسی بھی طرح کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ مقامی کاتب امام علی اسدی کے قلم کا نتیجہ ہے جسے قیاساً میر آمّن کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔

آپ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے قائم ہونے اور ڈاکٹر جان گل کرسٹ کی نگرانی میں شائع ہونے والی کتابوں سے قبل شمالی ہندوستان ہو یا جنوبی یہاں جتنی بھی اُردو و فارسی کی قلمی کتابیں تیار ہوتی تھیں اُن کے لیے کوئی نظام املا مقرر نہیں تھا اور نہ ہی رموزِ اوقاف جیسے علم سے کوئی واقف تھا۔ ہر شخص اپنی صواب دید کے مطابق لکھتا چلا جاتا تھا۔

انگریزوں کی کمپنی بہادر ہندوستانی ریاستوں پر قابض ہونا شروع ہو چکی تھی۔ نوجوان انگریز حکومت کا کام کاج چلانے کے لیے ہندوستان وارد ہو رہے تھے۔ انھیں یہاں کی زبان جاننا ضروری تھا۔ گل کرسٹ نے اِن نو واردوں کو اُردو زبان سکھانے کے لیے کالج میں داخل کرنا شروع کیا لیکن اِس کے پاس اِن کے نصاب کے لیے کوئی کتاب نہیں تھی۔ اِس نے ملک کے طول و عرض سے بہت سے منشی یہاں جمع کیے جن کے ذمے فارسی اور دوسری زبانوں سے اردو میں ترجمے کا کام سونپا گیا۔ بہت سی آسان اُردو میں کتابیں تیار ہو گئیں۔

زبان کی مشکلات کو دھیان میں رکھتے ہوئے سب سے پہلے گل کرسٹ نے ایک جامع نظام املا مرتب کیا پھر اِس سے بھی بڑا کام جو اِس نے کیا کہ اپنی زیر نگرانی جو کتابیں مرتب کرائیں اُن میں اِس نظامِ املا کی سختی سے پابندی کرائی۔ باغ و بہار کی اشاعتِ اوّل ۱۸۰۴ء میں یہ اہتمام اور التزام مکمل طور پر سامنے آتا ہے۔

گل کرسٹ نے ی کو چار قسموں میں بانٹا تھا: معروف، مجہول، لین، مشموم جب یہ لفظ کے آخر میں آئے گی اور معروف ہو گی تو اِس صورت ی میں آئے گی اور اِس کے نیچے نقطے نہیں ہوں گے۔ جیسے: دی، کی۔

جب مجہول ہو گی اور لفظ کے آخر میں آئے گی تو دراز صورت میں لکھی جائے گی نقطے اِس کے نیچے بھی نہیں ہوں گے۔ مثلاً: دے، کے، سے

وہ ی جو درمیانِ لفظ ہوتی ہے اور اُس کی آواز حرفِ ما قبل کی آواز کے ساتھ شامل ہو کر نکلتی ہے اُسے ''ہاے مشموم'' کہا ہے اِس کی پہچان کے لیے اِس کے نیچے دو نقطے ایک دوسرے کے اوپر لگائے ہیں۔ مثلاً: کیا، پیار۔

جب ی لفظ کے بیچ میں آتی ہے۔ اُس کا نام ''ہائے شوشہ دار'' رکھا۔ مجہول اور معروف کے امتیاز کے لیے مجہول پر ایک چھوٹا سا دائرہ (یعنی جزم مدّورہ) لگایا، جیسے: کھیل، دیر، جیل۔ حرفِ ما قبل پر حرکت نہیں ہو گی۔ اگر معروف ہے تو چھوٹا دائرہ نہیں ہو گا اور پہلے حرف پر کوئی حرکت نہیں ہو گی۔ جیسے: کیل، چیل۔

اسی طرح واو کی بھی چار قسمیں کی تھیں: معروف، مجہول، معدولہ، ما قبل مفتوح۔

مجہول واو کو یوں لکھا جائے گا: مور، چور، گول، جمع کی صورت میں کوئی علامت نہیں ہو گی جیسے: لڑکو، لڑکوں۔

واوِ معروف پر کوئی علامت نہیں ہو گی۔ ما قبل مفتوح پر آٹھ کے ہندسے جیسی علامت ہو گی، جیسے: قول، غور۔

واوِ معدولہ کا سر خالی رہے گا، جیسے: خود، خوشامد، چاروں کے حروفِ ما قبل خالی رہیں گے۔

ہائے ملفوظ اور ہائے مخلوط میں ہمیشہ امتیاز رکھا گیا۔ ہائے مخلوط کو دو چشمی صورت میں لکھا گیا۔ جیسے: گھر، تمھیں، تمھارے۔ ہائے ملفوظ شوشے دار ہو یا کہنی دار، اُس کے نیچے لٹکن دکھائی دیتا ہے، جیسے: کہو، ہی۔[۴۱]

اِن کے علاوہ اور بہت سی باتیں ہیں جنھیں یہاں درج کرنے کی ضرورت نہیں۔ اِن چیزوں کو یہاں لکھنے کا ہمارا یہ مقصد ہے کہ ایسا کوئی التزام نسخۂ ہانسی/نسخۂ جے پور میں نہیں ہے جسے قیاساً میر امّن کا بتایا گیا ہے۔

''بہ طورِ مثال شروع کتاب سے دو جملے [مطابقِ اصل] نقل کیے جاتے ہیں۔ اِن سے املا، اعراب، علامات اور رموزِ اوقاف کی صورت حال واضح ہو جائے گی:

''اب آغاز قِصّے کا کرتا ھون۔ ذرّہ کان دھر کر سُنو اور مُنصِفی کرو سَیر مین چار درویش کی یون لِکہا ھَے۔ اَور کہنی والی نے کہا ھَے۔ کہ آگے رُوم کی ملک مین کوئی شہنشاہ تھا۔ کہ نَوشیروان کی سِی عَدالت اَور حاتِم کی سِی سخاوت اُس کی ذات مین تَہی'' [۴۲]

اب نسخۂ ہانسی/نسخۂ جے پور کے خطّی عکس سے یہی دو جملے نقل کیے جاتے ہیں تاکہ آپ خود ان کا تقابل کر کے نتیجہ اخذ کر سکیں کہ آیا اِس نسخۂ جے پور کے ساتھ میر امّن کا دُور دُور تک کوئی تعلق رہا ہے۔

''اب آغاز قصی کا کرتاہون ذرا کان دہر کر سنو اور منصفی کرو سیر مین چار درویش کی یون لکھا ہی اور کہنی والی نی کہا ہی کہ آگی روم کی ملک مین کوئی شہنشاہ تہا کہ نوشیروان کی سی عدالت اور حاتم کی سی سخاوت اُسکی ذات مین تہی''۔[۴۳]

میر امّن نے روایتِ اوّل کے بعد ہندی مینول اور اشاعتِ اوّل زیرِ نگرانی جان گل کرسٹ تیار کی تھی۔ اِس نے اپنی دوسری کتاب گنجِ خوبی میں بھی اِسی املا، اعراب، علامات اور رموزِ اوقاف کا التزام رکھا۔ ۲۸ برس بعد یعنی ۱۸۳۲ء تک اُسے قصّۂ چہار درویش تو حرف بہ حرف یاد رہا لیکن باقی اصولوں کی پیروی کرنا وہ بھول گیا۔ کیا اِن

شواہد کی روشنی میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس خطّی نسخۂ پانسی کے ساتھ میر اَمّن کا کوئی واسطہ نہیں اور اِسے میر اَمّن کا نسخہ ثابت کرنے کے لیے جو حوالے ڈاکٹر فیروز احمد نے پیش کیے ہیں وہ سب بے بنیاد اور غیر معتبر ہیں۔

ڈاکٹر فیروز احمد نے مرزا حامد بیگ، ابوالخیر کشفی، کتاب ستّۂ شمسیہ اور اپنی تحقیق کے مطابق میر اَمّن کو ۱۸۳۲ء، ۳۷۔۱۸۳۶ء اور ۱۸۴۰ء تک زندہ رکھا۔ جب کہ ۱۸۰۶ء میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے نکلنے کے بعد ایسا کوئی دستاویزی ثبوت نہیں ملتا کہ وہ کہاں گیا، کب تک زندہ رہا اور کہاں سپردِ خاک ہوا اور اُس کے اہلِ خاندان پر کیا گزری۔

املائی اختلاف کی وجہ سے اِس نسخے کے مطالعے کے دوران نظر بہت سے مقامات پر رکتی ہے۔ درج ذیل میں چند الفاظ کی نشان دہی کی جاتی ہے:

نسخۂ جے پور کا اِملا	جدید اِملا
۱۔ انہوں (۵، ۸، ۹، ۱۰، ۱۳، ۱۶)	اِنھوں
۲۔ انھوں (ص ۱۰)	اِنھوں
۳۔ اُنہوں (ص ۹۹، ۱۹۹)	اُنھوں
۴۔ انہیں (ص ۷، ۱۰، ۱۳، ۲۹، ۳۰)	اِنھیں
۵۔ اُنہیں (۴۴)	اُنھیں
۶۔ ایڈیشن (ص ۲۱ پر چار بار)	اڈیشن (ص ۲۱ پر دو بار)

جب کہ اِسی صفحے کی تیسری سطر میں پہلے اڈیشن اور پھر ایڈیشن ایک ساتھ چھپے ہیں۔ صفحہ ۲۲ پر جدید املا اڈیشن تین بار اور ایڈیشن ایک بار نظر آتا ہے۔

۷۔ پیدائش (ص ۱۵، تین بار)	پیدایش
۸۔ فرمائش (ص ۱۱ دو بار)	فرمایش (ص ۵۱، ۷۴)
۹۔ استعفیٰ (ص ۱۱)	استعفا
۱۰۔ دیکھئے	دیکھیے
۱۱۔ کیجئے (ص ۶، حواشی ص ۲۴، ص ۳۰، ص ۸۳، ۸۷)	کیجیے (ص ۷۷، ۱۱۳، ۱۵۴)
۱۲۔ گزشتہ (ص ۸)	گذشتہ (۲۱)
۱۳۔ جنہوں (ص ۸)	جنھوں
۱۴۔ توجہ (ص ۸)	توجّہ

۱۵۔ جبکہ (ص۵، ۲۱، ۳۰، ۴۴)	جب کہ
۱۶۔ متعلق (ص۶، ۷، ۸، ۹، ۱۱)	متعلّق
۱۷۔ مقدمہ (ص۷، ۱۴، ۲۰، ۲۱)	مقدّمہ
۱۸۔ نشاندہی (ص۷، ۲۱، ۲۳)	نشان دہی
۱۹۔ دعویٰ (ص۲۳، دو بار، ۱۰، ۲۸)	دعوا
۲۰۔ بلکہ (ص۶، ۱۲، ۱۳، ۱۶، ۲۰، ۲۳، ۳۰)	بل کہ
۲۱۔ میرامن (ص۹ تین بار)	میرامّن (ص۹)
۲۲۔ میرامن (ص۹ سطر ۸)	میرامّن
۲۳۔ اعلیٰ ادنیٰ (ص۶۱)	اعلاادنا
۲۴۔ یونیورسٹی (ص۷)	یونی ورسٹی
۲۵۔ لئے (ص۱۰، ۱۳)	لیے (ص۹، ۱۰)
۲۶۔ باو بہار (ص۲۰)	باغ وبہار (ص۱، ۲۰)

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ بیسویں صدی کی پہلی پانچ دہائیوں کے بعد اُردو املا میں بہت سی تبدیلیاں آچکی تھیں۔ نئے لُغت مرتب ہو چکے تھے مگر پھر بھی کچھ حضرات ایسے تھے جو اِن تبدیلیوں کی طرف توجہ نہیں دے رہے تھے۔

ڈاکٹر فیروز احمد راجستھان یونی ورسٹی جے پور کے شعبۂ اردو و فارسی کے صدر رہ چکے تھے۔ اِن کی زیرِ نگرانی سینکڑوں طلبہ نے تعلیم پائی ہو گی، پھر کیا وجہ ہے کہ سولہ برس قبل جو اِنھوں نے اِس نسخۂ جے پور سے متعلق ایک تعارفی مضمون ماہ نامہ کتاب نما دہلی میں شائع کروایا تھا اُسی میں معمولی سی تبدیلی کے بعد اِسے اِس مطبوعہ نسخے کے مقدمے میں شامل کر دیا گیا، اور املائی تبدیلیوں کی طرف دھیان نہیں دیا گیا۔ جو چند املائی اختلافات پچھلے صفحات میں درج کیے گئے ہیں ایسے سیکڑوں اور اختلافات کی نشان دہی کی جا سکتی ہے۔

لگتا ہے مرتب نے خطّی نسخۂ جے پور کے کمپوز شدہ مسودے کی پروف ریڈنگ خود کی ہی نہیں اِس کا سب سے بڑا ثبوت صفحہ ۲۱ کی یہ سطریں ہیں:

''اِن سب کی بنیاد ۱۸۰۴ء میں فورٹ ولیم کالج، کلکتہ سے طبع شدہ پہلے اڈیشن پر رکھی گئی، اور آج تک باغ و بہار کا کوئی ایسا ایڈیشن مرتب اور شائع نہیں ہو سکا جس کی بنیاد کسی خطّی نسخے پر ہو''۔

ایک ہی سطر میں ''اڈیشن وایڈیشن'' ''کھی گئی'' نہیں، یہ ''رکھی گئی'' ہے۔اسی طرح صفحہ ۱۰ کی سطر ۱۴ پر ''لئے'' اور سطر ۱۵ پر ''لیے'' درج ہے۔اِن کے علاوہ مطبوعہ نسخے کے مختلف صفحات پر 'کیجئے'، 'کیجیے'، 'گزشتہ'، گذشتہ، 'میرامن' 'میرامّن' اور 'باوبہار' و 'باغ وبہار' درج ہیں۔

اب راقم دوایسے شواہد پیش کرنے جارہاہے جنھیں دیکھنے سے یہ ثابت ہوجائے گا کہ مرتب نے اِس خطّی نسخہ کے کمپوز شدہ مسوّدے کی پروف ریڈنگ خود کی ہی نہیں۔اِسے یاتو کسی شاگرد کے حوالے کردیاجو تحقیق کے اصولوں سے بالکل نابلد تھایااِسے کمپوزر کے رحم وکرم پر ہی چھوڑ دیااور وہاں سے یہ سیدھا پریس چلا گیااور کتاب چھپ کر منظرِ عام پر آگئی۔ مثلاً:

''ایس۔ڈبلیو۔فیلن کی پیدائش ۱۸۱۷ء بہ مقام کلکتہ ہے۔اِس نے ۱۸۳۷ء میں بیس برس کی عمر میں محکمۂ تعلیم، بنگال میں ملازمت اختیار کی۔اب اگر فیلن نے یہ کہا کہ اس نے میرامّن کی زبانی سنا تواپنی پیدائش ۱۸۱۷ء سے قبل یا پیدائش ۱۸۱۷ء کے فوراً بعد وہ میرامّن سے بات کرنے سے رہا۔اِس کے میرامّن سے بات کرنے کا زمانہ کیارہاہوگا؟ کیا ۳۷۔۱۹۳۶ء ہی ممکن نہیں؟ یوں ۳۷۔۱۹۳۶ء تک میرامّن کے حیات ہونے کا اِس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا''۔ (مطبوعہ نسخہ ۱۵)

اِس کے لیے فاضل مرتب نے حوالہ دیاہے 'باغ و بہار مرتبہ مرزا حامد بیگ (مقدّمہ) ص، ۵۰، لاہور ۲۰۰۴ء۔دوبار ۳۷۔۱۹۳۶ء نمایاں صورت میں لکھا گیاہے۔اِس سنہ کے مطابق میرامّن ۸۷۔۱۸۶ برس زندہ رہا۔ کیا کوئی ذی ہوش اِس بات پہ یقین کر سکتاہے۔اِسے نہ تو ہم کمپوزر کی غلطی کہہ سکتے ہیں اور نہ مرزا حامد بیگ کی۔ مرتّب حوالہ نقل کررہاہے تواُسے کمپوز شدہ مسودے کو دھیان سے پڑھنا چاہیے تھا، مگر اُنھوں نے ایسا نہیں کیا۔یہ تحقیق وتدوین کے اصولوں کی سراسر خلاف ورزی ہے۔مذکورہ بالا اقتباس میں جب ۱۸۳۷ء سامنے لکھا ہواہے تواُسے کیوں نظرانداز کیا گیا۔

اب ایسی ہی ایک دوسری مثال پیش کی جاتی ہے جس سے یہ ثابت ہوجاتاہے کہ مرتب نے اِس مسّودے کی تصحیح بنانے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی۔مرتب نسخۂ جدید (رشید حسن خاں) اور نسخۂ جے پور کے جملوں کے اختلافات پیش کرناچاہتاہے اوراِس طرف توجہ دلاناچاہتاہے کہ نسخۂ جے پور (میرامّن) کا متن نسخۂ جدید (رشید حسن خاں) کے متن سے بہتر اور معتبر ہے جسے رشید حسن خاں نے پانچ نسخوں کی مدد سے مرتب کیاہے۔صفحہ ۳۶ (مطبوعہ نسخۂ جے پور) پر وہ دونوں نسخوں کے عنوان یوں درج کرتاہے:

نسخۂ جدید (رشید حسن خاں) ۱۹۹۲ء　　نسخۂ جے پور مکتوبہ ۱۲۴۷ھ/۱۸۲۳ء

۱۲۴۷ھ مطابق ہے ۱۸۳۲ء۔ کیا مرتّب کی تصحیح بناتے وقت ۱۸۲۳ء پر نظر نہیں رُکی؟۔ جیسا کہ اِس سے قبل ذکر آچکا ہے کہ فاضل مرتّب نے اِس مسوّدے کی تصحیح خود بنائی ہی نہیں، وہ شاید اتنے مصروف رہے کہ اِس کام کی طرف وہ اپنی توجہ مبذول ہی نہیں کر سکے۔ اِسی لیے تو ایک ہی سطر میں ایک ہی لفظ کی دو دو املائی صورتیں نظر آتی ہیں۔ اتنے پر ہی بس نہیں اصل متن سے بہت سے الفاظ بھی چھوٹ گئے ہیں، صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مثلاً، مطبوعہ نسخۂ جے پور کے صفحہ ۲۴۲ کا دوسرا اقتباس یوں شروع ہوتا ہے:

''رات نیند اُچاٹ ہو گئی''

نسخۂ جدید (مرتبہ رشید حسن خاں، اشاعت ۲۰۰۹ء ص، ۲۳۳) کے آخری اقتباس کی شروعات یوں ہوتی ہے:

''تمام رات نیند اُچاٹ ہو گئی''۔

مرتب نے نسخۂ جے پور کی تدوین کے دوران جن ثانوی ماخذوں کے حوالے دیے ہیں اُنھیں تحقیق و تدوین کی کسوٹی پر پرکھ سے پہلے ہی ردّ کیا جا چکا ہے۔ مرتب نے اِس نسخے کی تدوین کے دوران نہ تو میر امّن کی روایتِ اوّل، نہ ہندی مینول اور نہ ہی اشاعتِ اوّل ۱۸۰۴ء، کے عکس اپنے سامنے رکھے۔ اگر انھوں نے ایسا کیا ہوتا تو اِن کے لیے بہت سی آسانیاں پیدا ہو جاتیں اور جو لغزشیں اِن سے سرزد ہوئیں اِن سے یہ محفوظ ہو جاتے۔

نسخۂ ہانسی/نسخۂ جے پور میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جو اصولِ تحقیق کے مطابق کھٹکتی ہیں۔ مرتب نے بہت سی ایسی روایتوں کو بلا تکلف قبول کر لیا جنھیں تحقیق و تدوین کے مقرر کردہ اصولوں کے تحت قبول نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ مرتب نے پہلے سے یہ طے کر لیا تھا کہ نسخۂ جے پور ایک خاص علاقے اور ایک خاص شخصیت سے تعلق رکھتا ہے۔ لہٰذا اس بنا پر یہ صورتِ حال پیدا ہوئی۔ پہلی بات یہ کہ جہاں بھی تعلقِ خاطر اور طے شدہ نقطۂ نظر کا عمل دخل ہوگا، وہاں تحقیق کا عمل دھندلا جائے گا، چاہے کوئی بھی بڑے سے بڑا محقق کیوں نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اِس نسخے کو مرتّب کرتے وقت اصولِ تدوین کی طرف کم سے کم توجہ دی گئی۔ متن کی تصحیح کے اصول اور طریقۂ کار کی تفصیلات اِن کے یہاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔

ہیرو ورشپ اچھی بات ہے، مگر جب جذباتی انداز ذہنوں کو متاثر کرتا ہے تو تحقیقی اصولوں کی پابندی پوری طرح نہیں ہو پاتی، یہی کچھ ڈاکٹر فیروز احمد کے ساتھ ہوا۔

وہ اِس نسخے کو چھاپنا چاہتے تھے وہ چھپ گیا، مرتّبین میں نام شامل کروانا تھا وہ ہو گیا۔ آج کے زمانے میں کس کو پڑی ہے کہ وہ یہ دردِ سر مول لے۔

اصل میں اِس نسخے کو مرتّب نہیں کیا گیا بُھگتا گیا ہے۔ بہتر ہوتا اگر مرتّب اِس نسخے کو معمولی سے تعارف کے ساتھ عکسی چھاپ دیتا تو اِس کی اہمیت بڑھ جاتی۔ مطبوعہ نسخۂ جے پور کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ مرتّب تحقیق و تدوین کے فن سے پوری طرح آگاہ نہیں۔ تدوین کے طالب علم کو اِن کے یہاں اِس فن کی تفصیلات کو تلاش نہیں کرنا چاہیے۔

حوالہ جات:

۱۔ احمد، فیروز، ڈاکٹر، ۲۰۱۲ء، باغ و بہار (خطی نسخۂ جے پور)، گلوبل اردو کمپیوٹرس اینڈ پرنٹرس، جے پور، ص ۲۷

۲۔ بیگ، مرزا حامد، ۲۰۰۴ء، میر امن دلّی والے، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ص ۱۱۵

۳۔ احمد، فیروز، ڈاکٹر، ۲۰۱۲ء، باغ و بہار (خطی نسخۂ جے پور)، ص ۷

۴۔ ایضاً، ص ۶

۵۔ خاں، رشید حسن، ۲۰۰۹ء، باغ و بہار، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دلّی، ص ۱۴

۶۔ ایضاً، ص ۱۵

۷۔ احمد، فیروز، ڈاکٹر، ۲۰۱۲ء، باغ و بہار (خطی نسخۂ جے پور)، ص ۱۳

۸۔ ایضاً، ص ۱۲

۹۔ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے: بیگ، مرزا حامد، ۲۰۰۴ء، میر امن دلّی والے، اردو سائنس بورڈ، لاہور

۱۰۔ احمد، فیروز، ڈاکٹر، ۲۰۱۲ء، باغ و بہار (خطی نسخۂ جے پور)، ص ۱۳

۱۱۔ بیگ، مرزا حامد، میر امن دلّی والے، مشمولہ: 'نقوش'، خاص نمبر، جلد، اوّل، ص ۳۳۶

۱۲۔ ایضاً، ۳۴۰

۱۳۔ خاں، رشید حسن، ۲۰۰۹ء، باغ و بہار، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دلّی، ص ۲۷

۱۴۔ بیدار، پروفیسر مجید، ۳ مارچ ۲۰۱۶ء، اشاعتی سرگرمیوں کا مرکز حیدرآباد، مشمولہ: اردو دنیا، نئی دہلی، جلد ۱۸، شمارہ: ۳، ص ۲۴

۱۵۔ احمد، فیروز، ڈاکٹر، ۲۰۱۲ء، باغ و بہار (خطی نسخۂ جے پور)، ص ۱۵

۱۶۔ سکسینہ، رام بابو، ۱۹۴۹ء، تاریخ ادب اردو، اشاعت چہارم، مطبع منشی تیج کمار، لکھنؤ، ص ۸

۱۷۔ تنہا، محمد یحییٰ، ۱۹۷۹ء، سیر المصنفین، مقدمہ و حواشی از امیر اللہ شاہین، ادارہ اشاعت ادب، میرٹھ، ص ۱۷

۱۸۔ بخاری، ڈاکٹر سہیل، ۱۹۸۷ء، اردو داستان تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ص ۱۱۶

۱۹۔ خاں، رشید حسن، ۲۰۰۹، باغ وبہار، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دلّی، ص ۲۴۔۲۹

۲۰۔ احمد، فیروز، ڈاکٹر، ۲۰۱۲ء، باغ وبہار (خطی نسخۂ جے پور)، ص ۱۶

۲۱۔ خاں، رشید حسن، ۲۰۰۹، باغ وبہار، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دلّی، ص ۳۰۔۳۱؛ رشید حسن خاں صاحب نے گل کرسٹ کی جس انگریزی کتاب کا حوالہ دیا ہے، وہ اس کا تیسرا ایڈیشن ۱۸۲۰ء کا ہے جو لندن سے شائع ہوا تھا۔ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا نئی دہلی میں محفوظ ہے۔ اس کا نمبر ۴۳۔۴۹۱ ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن کلکتہ سے ۱۸۰۲ء میں شائع ہوا تھا۔

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۰

۲۳۔ احمد، فیروز، ڈاکٹر، ۲۰۱۲ء، باغ وبہار (خطی نسخۂ جے پور)، ص ۱۹۵

۲۴۔ ایضاً، ص ۳۱۔ ۳۲

۲۵۔ ایضاً، ص ۳۲

۲۶۔ ایضاً، ص ۳۳

۲۷۔ ایضاً

۲۸۔ ایضاً، ص ۳۴

۲۹۔ ایضاً، ص ۳۴۔ ۳۵

۳۰۔ ایضاً، ص ۹۰

۳۱۔ ایضاً

۳۲۔ ایضاً

۳۳۔ ایضاً

۳۴۔ خاں، رشید حسن، ۲۰۰۹، باغ وبہار، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دلّی، ص ۵۵

۳۵۔ احمد، فیروز، ڈاکٹر، ۲۰۱۲ء، باغ وبہار (خطی نسخۂ جے پور)، ص ۹۵

۳۶۔ ایضاً، ۱۳۸

۳۷۔ رشید حسن خان کے خطوط، فروری، ۲۰۱۱ء، مرتبہ: ٹی آر رینا، ص ۷۸

۳۸۔ احمد، فیروز، ڈاکٹر، ۲۰۱۲ء، باغ وبہار (خطی نسخۂ جے پور)، ص ۳۶۔۳۸

۳۹۔ ایضاً، ص ۲۳۲

۴۰۔ ایضاً، ص ۴۲

۴۱۔ خاں، رشید حسن، ۲۰۰۹، باغ و بہار، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دلّی، ص ۸۵۔۸۷

۴۲۔ ایضاً، ص ۹۳

۴۳۔ احمد، فیروز، ڈاکٹر، ۲۰۱۲ء، باغ و بہار (خطی نسخۂ جے پور)، ص ۵۵

Abstract

This article aims to highlight the careless editing work of a very popular Urdu text *Baagh o Bahar* based on the text of Jaipur. The writer of the article explains his bases in the beginning of the article to critique the texts. The editor has left many things unexplained. The editor should have mentioned that how he found the text. Its colophon mentions that it was written in Hansi in the time of the Company then Why the text is called from Jaipur? The text has neither the stamp of a library nor any sign of an institution where it was kept. It has no sign of a personal collection as well. Declining texts of *Baagh o Bahar* edited earlier on, the editor claims to give reason of his editing work as this was edited on a manuscript or hand-written text which is only way to avoid mistakes in the text.

Keywords: Baagh o Bahar, Jaipur, Urdu text